Rs. 200/-

بارگاہِ سلطان المشائخ حضرت خواجہ سید نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کا

ماہنامہ

مُنادی

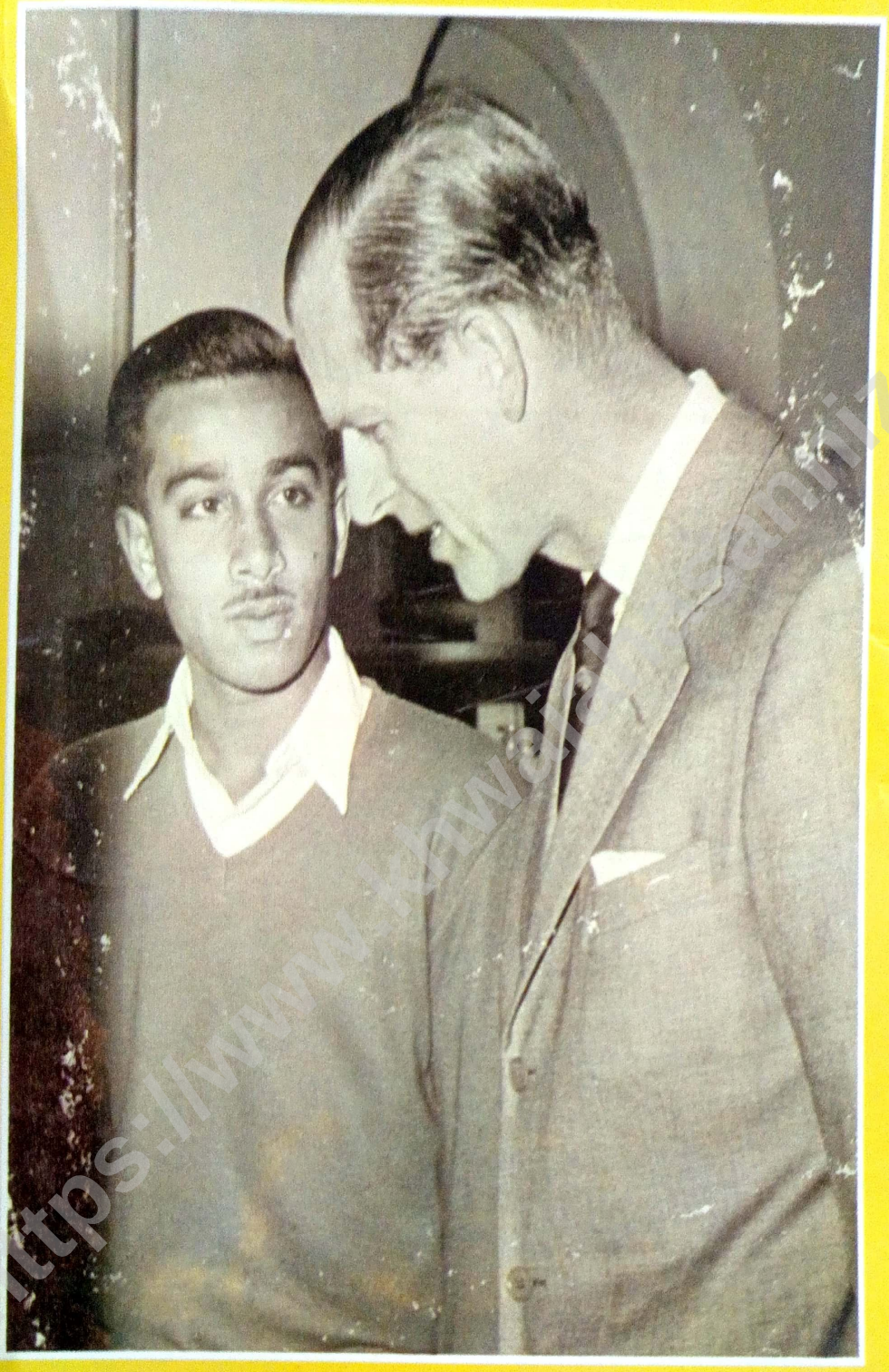
نئی دہلی

خواجہ حسن نظامی نمبر



مزار مبارک قدیم ترین دہلوی بزرگ شمس العلماء حضرت خواجہ سید حسن نظامی

© https://www.khwajahasannizami.life



موجودہ برٹش ایمپائر کے چیف

خواجہ حسین نظامی کے بڑے فرزند خواجہ سلمان ایزدی نظامی

© https://www.khawajahasannizami.life

مدیر
خواجہ حسن ثانی نظامی
مدیرِ معاون
خواجہ سید محمد نظامی

درگاہ شریف اور منادی کے بارے میں خط و کتابت کرنے اور قیمت جمع کرانے کا پتہ
خواجہ حسن ثانی نظامی
ڈاکخانہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

تحریری معاون قدیم
شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی
عالی جناب ریحان احمد عباسی

ماہنامہ منادی کی اشاعت

بارگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے ایمان اور امن کی ندا دینے والا اور اُن کے جانشین امام المشائخ شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی یادگار

ماہنامہ

منادی

نئی دہلی

منادی ۱۹۲۶ء سے جاری ہے یہ ۸۶ ویں جلد (اکتوبر ۲۰۱۲ء) کا دسواں شمارہ ہے

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا: ”جب کسی کو دولت میسر آئے تو اُسے خرچ کرنا چاہیے کہ اس سے کمی نہیں آتی، اور جب دولت کسی سے منہ پھیر لے تو اُس وقت بھی خرچ کرنا چاہیے، کیونکہ جب اس کو جانا ہی ٹھہرا تو پھر بہتر یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہاتھ سے دے ڈالے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ شیخ نجیب الدین متوکلؒ نے اس مفہوم کو اس عبارت میں بیان کیا ہے کہ ”جب آئے تو دو کہ کم نہ ہوگی اور جب جائے تو نہ روکو کہ ٹھہرے گی نہیں۔“

فہرست حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نمبر

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ (منقبت)	۲	جناب رفعت سروش
خواجہ حسن نظامیؒ کا نثری اسلوب	۳	جناب شمس الرحمٰن فاروقی
خواجہ حسن نظامیؒ کی دعائیں	۹	پروفیسر اختر الواسع
۱۸۵۷ء اور خواجہ حسن نظامیؒ	۱۲	پروفیسر شریف حسین قاسمی
حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا سفرنامہ	۱۶	پروفیسر محمد اجتباء ندوی
حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی خاکہ نگاری	۲۳	جناب مجتبیٰ حسین
حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اور مذہبی مفاہمت	۲۷	خواجہ حسن ثانی نظامی

سالانہ قیمت
ہندوستان میں
ایک سو روپے
غیر ممالک سے
پندرہ ڈالر
فی پرچہ
دس روپے

پرنٹر پبلشر خواجہ حسن ثانی نظامی نے، ایم آر پرنٹرس، گلی گڑھیا کوچہ چیلان، دہلی ۲ میں چھپوا کر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۱۳ سے شائع کیا

© http://www.khwajahasannizami.life

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

جناب رفعت سروشؒ

وہ شیخ شریعت، وہ پیر طریقت، مجسم شرافت، سراسر محبت مفسر وہ قرآن کی آیتوں کا، وہ اک ترجمان پیام رسالت نوا صوفیانہ، سخن شاعرانہ، نظر عارفانہ، بیاں عالمانہ عطاء کر گیا ہے وہ اتنا خزانہ، کرے گا سدا استفادہ زمانہ بتایا ہمیں اپنے حسن عمل سے تصوف کا مطلب نہیں ترکِ دنیا عمل زندگی ہے، عمل آگہی ہے، عمل سے ہی ملتی ہے دنیا و عقبیٰ وہ گفتار، شہد و شکر کی حلاوت، وہ کردار، فولاد کی سی صلابت مسخر کرے دشمنوں کے دلوں کو، وہ طرز تکلم، وہ سحرِ خطابت قلم اس کی تلوار رزم خرد میں، قلم گل فشاں بزم علم و ہنر میں قلم کے نئے قافلوں کا وہ رہبر، دکھائیں ادب کی نئی شاہرائیں وہ خواجہ حسن، نور شمع نظامیؒ، بزرگان دین مبین کا پیامی مقدس، مطہر، مفخر، معزز رہے گی سدا اس کی ذات گرامی سروشؔ اس کے مرقد پہ روز ابد تک یونہی بارش نور ہوتی رہے گی اور اس خاکِ اطہر کی برکت سے ہر اک بلائے جہاں دور ہوتی رہے گی

□□□

© https://www.khwajahasannizamilife

خواجہ حسن نظامیؒ کا نثری اسلوب

شمس الرحمٰن فاروقی

خواجہ حسن نظامیؒ کی نثر کے بارے میں بہت سی متضاد باتیں کہی گئیں ہیں۔ اتنا تو سب مانتے ہیں کہ خواجہ صاحب کی نثر بے مثال حسن کی حامل ہے، لیکن اس حسن کا راز کس بات میں ہے اس سوال کے جواب پر نقادوں میں اتفاق رائے نظر نہیں آتا، اسی طرح، تقریباً سب لوگ متفق ہیں کہ خواجہ صاحب کی تحریر میں تصوف کا رنگ غالب ہے، لیکن یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ تصوف کے رنگ سے کیا مراد ہے، یعنی تصوف کے وہ کون سے اصول اور نکات ہیں یا صوفیانہ نقطۂ نظر کے وہ کون سے صفات ہیں، جو خواجہ صاحب کی نثر میں نظر آتے ہیں۔ اس مضمون میں مختصراً انہی دو سوالوں سے بحث ہے۔ میرے خیال میں خواجہ حسن نظامیؒ کے اسلوب کی خوبصورتی کا راز یہی ہے کہ وہ اشیاء کو صوفی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ صوفی کی نگاہ سے میری مراد وہ نگاہ ہے، جو ہر شے میں وحدت دیکھتی ہے۔

ان باتوں کی تفصیل میں جانے سے پہلے ایک نظر ان خیالات پر بھی ڈالتے چلیں، جو حسن نظامی کی نثر اور فکر کے بارے میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ فکر کے بارے میں تو ملا واحدی نے بنیادی بات کہہ ہی دی ہے۔ ''سی پارۂ دل'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ''خواجہ صاحب کی تحریر میں غالب مقصد تصوف ہے۔'' اسی طرح حسن نظامی کے اسلوب کے بارے میں بھی پہلی اہم بات ملا واحدی نے ہی لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خود خواجہ صاحب کے بقول محمد حسین آزاد اور عبدالحلیم شرر کی تحریریں میری لفظی استاد ہیں۔

خواجہ صاحب کے نقادوں کے لیے مشکل یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ ان کے حالات زندگی معلوم ہیں، اس لیے یہ کہہ دینا تو آسان ہے کہ حسن نظامی کی فکر صوفیانہ ہے، لیکن جب حسن نظامی کے ادبی سلسلے کی بات ہوتی ہے تو فوراً ہی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسا غالباً اس لیے ہوا ہے کہ ہر شخص نے حسن نظامی سے زیادہ اپنے تعصبات پر اعتبار کیا ہے۔ چنانچہ اسی ''سی پارۂ دل'' کے دیباچہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کو ملا واحدی صاحب کی بات سے اختلاف ہے۔ مولوی عبدالحق کے خیال میں حسن نظامیؒ کا طرز، آزاد سے بالکل الگ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آزاد میں تصنع زیادہ ہے، جبکہ خواجہ صاحب کے جملوں اور فقروں میں ''فکر و تراوش'' اس خوبی سے پوشیدہ ہے کہ بے تکلفی اور بے ساختہ پن اس پر قربان ہے۔ مولوی صاحب کے خیال میں حسن نظامیؒ کا رنگ مرزا غالب سے بہت ملتا جلتا ہے، لیکن اس میں غالب کی ظرافت کے بجائے سوز و گداز ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کو غالب والی بات سے غالباً اتفاق نہیں ہے، کیونکہ وہ فرماتے ہیں ''خواجہ حسن نظامی اردو نثر کے نظیر اکبرآبادی تھے''۔ گوپی چند نارنگ نے اس بات سے صاف انکار کیا ہے کہ اسلوبیاتی اعتبار سے حسن نظامیؒ کا کوئی تعلق محمد حسین آزاد یا غالب سے ہے، لیکن گوپی چند نارنگ بھی ''ارضیت اور پراکرتی احساس'' کی بناء پر حسن نظامیؒ کو اردو نثر کا نظیر اکبرآبادی کہتے ہیں۔ اپنے مضمون کے آخر میں وہ نثر کی حد تک ''زمینی احساس'' کا جداامجد میر امّن کو قرار دیتے ہیں۔ اب مشکل یہ ہے کہ سید حامد نے خواجہ حسن نظامیؒ کی تحریروں کو نگارخانوں سے تشبیہہ دی ہے اور یہ بات بڑی حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد حسن فرماتے ہیں کہ حسن نظامیؒ کی نثر میں نہ ردیف و قافیہ ہے، نہ تشبیہہ کا جادو، نہ

استعارے کی بیساکھی، اور سیدھی سادی نثر میں یوں لکھتے چلے گئے، جیسے وہ ان سب سے بے نیاز ہوں۔''

سید حامد نے خواجہ حسن نظامیؒ کی نثر کے صوتی حسن کا ذکر کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے خواجہ صاحب کی نثر کے انضمام و انضباط کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ نثر تخیلی سرشاری کا پتہ دیتی ہے، اس لیے وارفتگی کے ساتھ ساتھ اس کی اہم خوبی اس کا صوتی آہنگ اور متوازی کلموں کا غیر ارادی و غیر شعوری استعمال ہے۔'' نارنگ نے سیمول (SAMUEL LIVIN) کے حوالے سے اس صفت کو COUPLINGS کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ علم بدیع میں مذکور سجع اور ترصیع سے زیادہ متحرک، وسیع اور جامع متصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو نارنگ صاحب نے Coupling قرار دیتے ہوئے مشرقی علم بلاغت کی دسترس سے باہر قرار دیا ہے، وہ چیز دراصل توازن کے نام سے اس علم میں پہلے ہی سے معروف ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ صاحب کے یہاں توازن کی صفت نمایاں ہے، لیکن یہ خوبی کم و بیش ہر اچھے نثر نگار کے یہاں مل جائے گا۔

تنقیدی آراء کے اس مختصر تذکرے سے یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ خواجہ حسن نظامی کے اسلوب کی دلکشی کو محسوس تو سب کرتے ہیں، لیکن اس دلکشی کے وجوہ پر اتفاق نہیں ہے۔ عدم اتفاق کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ لوگوں نے اپنے اپنے تعصبات کو پیش نظر رکھا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل باتوں پر غور کیجیے۔

۱۔ مولوی عبدالحق کو محمد حسین آزاد کے یہاں تصنع نظر آتا ہے، لیکن اسی سانس میں وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامیؒ کے یہاں بھی فقروں کی تراش خراش کا بڑا اہتمام ہے۔ اس تضاد کو حل کرنے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب اپنی فنکاری کو بڑی خوبی سے چھپا جاتے ہیں۔ حالانکہ مولوی صاحب کے اس بیان میں تضاد در تضاد ہے، کیونکہ اگر خواجہ صاحب اپنی صناعی کو چھپا جاتے ہیں تو پھر وہ مولوی صاحب کو نظر کیسے آتی ہے؟ اور اگر نظر آجاتی ہے تو پھر آزاد کی صناعی اور حسن نظامی کی صناعی میں کیا فرق رہا؟ آزاد کی صناعی کو تصنع کیوں کہا جائے اور حسن نظامی کی صناعی کو بے ساختگی سے کیوں تعبیر کیا جائے؟

۲۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ آزاد اور حسن نظامیؒ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ آزاد کا سب سے اہم طریق کار رعایت اور مناسبت ہے، جبکہ حسن نظامی کا سب سے اہم طریق کار وہ تجسیم ہے جو استعارے کی ایک شکل ہے۔ رومن جاکب سن Roman Jacobson کے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ آزاد کے یہاں بنیاد Contiguity پر ہے اور حسن نظامی کے یہاں بنیاد Displacement پر ہے۔ یہاں میں اس بات سے بحث نہ کروں گا کہ جاکب سن نے اوّل الذکر کو Fiction اور موخر الذکر کو شعر کی صفت بتایا ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ آزاد رعایت اور مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''آب حیات'' سے یہ فقرے کسی جستجو کے بغیر حاضر ہیں۔

> ''جب ان کے چراغ خاندان سید خورشید علی نفیس بھی شعاع توجہ سے بھی دریغ فرمائیں تو غیروں سے کیا امید ہو۔ انھوں نے آزاد خاکسار کو آبِ حیات کی رسید سے بھی شاداب نہ کیا۔''

مندرجہ بالا عبارت میں ''چراغ''، ''خورشید''، ''نفیس''، ''شعاع''، ''خاکسار''، ''آب حیات'' اور ''شاداب''۔ یہ سب الفاظ رعایت اور مناسبت کے آئینہ دار ہیں۔ اس کے برخلاف خواجہ صاحب کی تحریر میں سے یہ عبارت بھی بلا جستجو حاضر کرتا ہوں۔

> ''یہ سن کر لالٹین کی روشنی لرزی، ہلی، کپکپائی، گویا وہ میری ناشناسی و نادانی پر بے اختیار کھلکھلا کر ہنسی اور کہا۔ اے نور خدا کے چراغ! آدم زاد! سن لالٹین اس روشنی کا نام ہے جو بتی کے سر پر رات بھر آرا چلایا کرتی ہے۔''

مندرجہ بالا عبارت میں لالٹین اور اس کی لَو اپنے اصل وجود سے مختلف وجود کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ یعنی انھوں نے کسی چیز کو Displace کر کے اس کی جگہ لے لی ہے۔ یہی استعارے کا جوہر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ محمد حسین آزاد کے یہاں استعارہ یا تشبیہ نہیں ہے۔ ہے اور خوب ہے۔ لیکن آزاد کا استعارہ اور تشبیہ اکثر و بیشتر رعایت یا مناسبت کا پابند ہوتا ہے مثلاً ''آب حیات'' کا یہ جملہ دیکھیے!

''ہمیں چاہیے کہ تھوڑی دیر کے لیے شہد کی مکھی بن جائیں، جہاں رسیلا پھول دیکھیں جا بیٹھیں۔ جالے اور میلے میلے پتوں سے بچیں۔ جب رس لے چکیں فوراً اڑ جائیں۔''

یہاں شہد کی مکھی استعارہ ہے، لیکن مکھی کی مناسبت سے ''جالے'' اور میلے میلے پتوں'' کا ذکر آ گیا ہے، کیونکہ مکھی مکڑی کے جالے میں گرفتار ہوتی ہے اور میلے سوکھے پتوں پر مکڑیاں اکثر گھر بناتی ہیں۔ اب حسن نظامی کا ایک فقرہ دیکھیے:

''عید کے چاند نے کہا مجھ کو دیکھو، مدنی محبوب کے ابرو کا خم اسی شکل کا تھا۔ آسمانی کنارے کی شفق بولی اور رخسار کی رنگت دیکھنی ہو تو مجھ پر نظر ڈال لو، اس میں کچھ اسی قسم کا روپ تھا۔ سامنے سے تاریکی دوڑ کر آئی اور شرما کر کہنے لگی، گیسو مجھ سے ملتے جلتے تھے۔''

یہ پوری عبارت تشبیہات پر قائم ہے، لیکن اس میں رعایت کوئی نہیں ہے۔

۳۔ اوپر کے تجزیوں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی ہوگی کہ خواجہ صاحب کے یہاں تشبیہ و استعارہ کثرت سے وارد ہوتے ہیں۔ رہا سوال اس بات کا کہ انھوں نے قافیہ بالکل نہیں استعمال کیا ہے تو خود ڈاکٹر محمد حسن نے جو چند اقتباسات نقل کیے ہیں ان میں بھی قافیہ اور نیم قافیہ نمایاں ہے، ملاحظہ ہو:

(الف)۔ ''میری سب کتابیں چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا خدا نے پردہ ڈھک لیا۔''

اس عبارت کا آدھا احسن صرف اس بات میں ہے کہ اس میں حسب ذیل ہم قافیہ الفاظ استعمال ہوئے ''گیا، بڑا۔ تھا خدا۔ پردہ۔ لیا۔''

(ب) ''بیچارہ غریب تھا۔ خلوت نشیں تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔''

اس عبارت میں حسب ذیل نیم قافیے ہیں۔ غریب، نشیں، حقیر، ذلیل اور دو مکمل قافیے ہیں۔ خلوت، خلقت۔

(ج) ''اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا، جی دکھایا تھا''

اس عبارت کا مقفع ہونا محتاج بیان نہیں ہے۔

(د) ''نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن''

اس عبارت میں حسب ذیل قافیے ہیں: کا، سا، زہریلا، تھا، کا، سا، والا ایک نیم قافیہ بھی ہے۔ ڈنک اور پھن۔

(ہ) یہ ''غافلوں کے لیے صور ہے اور عاقلوں کے لیے جلوۂ طور۔

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گزر گیا''

یہاں حسب ذیل قافیے ہیں۔ غافلوں، عاقلوں، صور، طور۔ مر گیا، گزر گیا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ حسن نظامیؒ نے مقفع اور مسجع نثر بھی لکھی ہے اور ترصیع کا استعمال کیے بغیر ہم قافیہ الفاظ بھی خوب برتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ فرض کرنا کہ حسن نظامی کے یہاں ''بچے کی معصومیت اور بھولے پن کا آرٹ ہے'' معصومیت اور بھولے پن کے سوا کچھ نہیں۔

۴۔ اب رہا سوال نظیر اکبر آبادی کا تو اس باب میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ نظیر اکبر آبادی کی بنیادی بات یہ ہے کہ وہ (اپنی

© https://www.KhwajaHasanNizami.life

نظموں کی حد تک) عوامی اور عامیانہ شخصیت کا اظہار کرتے ہیں اس کے برخلاف حسن نظامی کی شخصیت میں Elitism ہے۔ Elitism کا ترجمہ ''اشرافیت'' میں اسلیے نہیں کرتا کہ لفظ اشرافیت میں تکبر اور تبختر کا تاثر نمایاں ہے۔ Elitism میں یہ عناصر نہیں ہیں۔ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ کلام ایسے نکات پر مشتمل ہو جو ہر کہہ ومہ کی زبان پر نہ ہو۔ تصوف خود ایک طرح کی Elitism ہے۔ اسی لیے عربی میں کہاوت ہے۔ من افع کلا لسانہ (جس نے پہچان لیا اس کی زبان گنگ ہوگئی) اسی کو سعدی نے یوں بیان کیا ہے ع

ایں مدعیاں در طلبش بے خبر آں نند
کارا کہ خبر شد خبرش باز نیآمد

حسن نظامی کے یہاں زندگی کے چھوٹے چھوٹے مظاہر کیڑوں مکوڑوں، روز مرّہ کی چیزوں اور گھریلو باتوں کی کثرت دیکھ کر لوگوں کو گمان گزرتا ہے کہ ان میں اور نظیر اکبرآبادی میں کوئی خاص مشابہت ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ نظیر نے روز مرہ کی چیزوں کو روز مرہ کی سطح پر برتا ہے، جبکہ حسن نظامیؒ نے ان چیزوں کو حقائق ومعارف بیان کرنے کا بہانہ بنایا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حسن نظامی کے یہاں سادگی، سلاست، بیساختگی، شگفتگی وغیرہ کا ذکر چاہے کتنا ہی مبنی برحقیقت ہو، اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ آخر حسن نظامی کا اسلوب اس قدر دلکش اور موثر کیوں ہے۔ سادگی، بیساختگی، شگفتگی وغیرہ تنقیدی اصلاحات نہیں ہیں۔ یہ محض تاثراتی الفاظ ہیں۔ ان کے استعمال سے تنقید کا حق نہیں ادا ہوتا۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ یہ صفات تو کم وبیش ملا رموزی کے یہاں بھی مل جائیں گی، پھر حسن نظامی کا امتیاز کیا رہا؟

حسن نظامی کے یہاں تشبیہ واستعارہ اور قافیہ کی کثرت کی طرف میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ یہ چیزیں اپنی جگہ اہم ہیں اور حسن نظامی کے اسلوب کی دلکشی کا راز ایک حد تک ان چیزوں میں تلاش کیا جاسکتا ہے، لیکن یہاں بھی وہی مشکل ہے کہ یہ صفات تو اوروں کے یہاں بھی مل سکتی ہیں۔ اگر حسن نظامی کی انفرادیت ثابت کرنا ہے تو ہمیں یہ بھی دکھانا ہوگا کہ تشبیہ واستعارہ وقافیہ وغیرہ کو برتنے میں حسن نظامی کا کوئی خاص طرز بھی ہے۔

Victor Shklovsky نے ایک بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ تشبیہ واستعارہ وغیرہ یا اس طرح کی تمام چیزیں دو پہلو رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ تمام چیزیں کسی ایک ہی مقصد کے حصول میں کارآمد ہوسکتی ہیں اور دوسرا پہلو یہ کہ ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جو دوسروں پر فوقیت رکھتی ہو۔ یہاں Shklovsky نے علم بدیع کا ایک نازک مسئلہ چھیڑ دیا ہے۔ اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ فن کا کام یہ ہے کہ وہ نہ اشیاء کو بیان کرے اور نہ ان کی نقل کرے، بلکہ یہ کہ وہ اشیاء کا انکشاف کرتا ہے۔ لہٰذا فن اشیاء کی شیئیت کو واضح کرتا ہے اور اشیاء کے بارے میں ہمارے ادراک کو شدید تر کرتا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے فن، اشیاء کو اجنبی بنا کر پیش کرتا ہے۔ To Defamiliarize to make strance Shklovsky کے بیان کے مطابق اجنبی بنانے کے اس عمل میں تمام صنائع و بدائع یا کوئی ایک صنعت یا ترکیب استعمال ہوسکتی ہے۔ یعنی ہر وہ چیز جو اس عمل میں معاون ہو، فن اس کو برتتا ہے۔ اس موقع پر Shklovsky کے مضمون Art As Technique کے یہ چند جملے پیش کرنا مناسب ہوگا۔

''فن کا مقصود یہ ہے کہ ہم زندگی کے احساس کو دوبارہ حاصل کرسکیں۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ ہم اشیاء کو محسوس کرسکیں۔ فن کا کام یہ ہے کہ پتھر کو پتھریلا بنادے۔ فن کا مقصد یہ ہے کہ اشیاء جس طرح دیکھی جاتی ہیں اور اس سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے، اسے ہم تک پہنچائے، نہ کہ اشیاء کو اس طرح پہنچائے جیسا ہم انھیں

© https://www.khwajahasannizami.life

جانتے ہیں۔ فن کی تکنیک یہ ہے کہ اشیاء کو اجنبی بنایا جائے، اس کی ہیئت کو مشکل بنایا جائے اور ادراک کی مشکل اور ادراک کی مدت کو طویل کیا جائے کیونکہ ادراک کا عمل خود اپنی جگہ پر ایک جمالیاتی مقصود ہے اور اسے طویل تر کرنا چاہیے۔''

اب شاید یہ بات ظاہر ہوگئی ہوگی کہ حسن نظامی کے یہاں اشیاء سے زیادہ ان کا ادراک اہم ہے۔ ان کے یہاں ادراک خود ایک استعاراتی عمل بن جاتا ہے اور روزمرّہ کی چیزوں کو اجنبی بنا کر پیش کرتا ہے۔

''جھینگر کا جنازہ'' بہت ہی مشہور مضمون ہے اور اس کے اقتباسات اوپر آ بھی چکے ہیں۔ لہٰذا چند ایسے مضامین کو دیکھتے ہیں جو کم مشہور ہیں۔ ''لوہے کی طریقت'' میں انسان کو یوں بیان کیا ہے ''خاک کی مورت، مٹنے والی صورت، اور زور کا یہ عالم کہ سمندر کی چھاتی پر مونگ دلنے کو تیار۔ بجلی اور ہوا کے سر پر سوار۔'' ''توہی ہے اے خدا'' میں خدا کی تعریف یوں شروع کی ہے۔ ''لوہے کے قلم کو لال نیلے آنسو دینے والے، لوہے کی توپ کو آگ کی آہ بخشنے والے۔'' ''حروف کی دُعا'' میں یوں کہا ہے ''خدایا! ایسے آدمی پیدا کر جو ہمارے پُر اسرار وجود کا اصلی مطالعہ کریں اور ہمارے ذریعے تُو ان کو مل جائے اور جب تیرا ان کا وصال ہو تو اس خوشی میں ہماری مراد بھی پوری فرما اور وہ یہ ہے کہ ہم کو نااہل لوگوں کے قلم سے بچا۔ اپنے نافرمانوں کے قبضے میں نہ دے، جو ہم کو تیرے وجودِ واحد کے انکار میں استعمال کریں۔'' یہ واضح کرنے کی ضرورت شاید نہ ہو کہ ان تمام عبارتوں میں نہ صرف اشیاء بلکہ تصورات بھی ادراک کا موضوع بن گئے ہیں اور ہر چیز استعارے کے زور پر اتنی اجنبی بنا دی گئی ہے کہ وہ ہماری توجہ کو کھینچتی ہے۔

طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں مندرجہ بالا اقتباسات کا تجزیہ تفصیل سے کرتا اور مزید اقتباسات کی بھی روشنی میں یہ دکھاتا کہ حسن نظامی کا اصل فن اس بات میں ہے کہ وہ اشیاء کو اجنبی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی ''دیا سلائی'' محض دیا سلائی نہیں، بلکہ ایک زندہ وجود ہے۔ درخت کے تنے سے لے کر دیا سلائی کی تیلی بننے کی منزل تک ہر قدم پر نیا ادراک ہے۔ یہ صرف اتنی ہی بات نہیں ہے، جو قابوس نامے میں ہے کہ شاعری چھوٹے معنی کو بڑا اور بڑے معنی کو چھوٹا کرتی ہے۔ یہ صرف اتنی ہی بات نہیں ہے، جو Shelly نے کہی تھی کہ شاعری مانوس اشیاء کو نامانوس اور نامونوس اشیاء کو مانوس بنا دیتی ہے۔ اہل معاملہ یہ ہے کہ خواجہ حسن نظامی کا ادراک ہر شے کو فی نفسہٖ اجنبی رنگ میں دیکھتا ہے اور وہ اپنے اسلوب کا ہر حربہ اس اجنبی پن کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

آخری سوال یہ رہا ہے کہ حسن نظامی کا ادراک ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب ان کے تصوف سے مل سکتا ہے۔ افسوس کہ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس کو آسان کر کے بیان کرنے کے لیے مولانائے روم کی مثنوی کے دفتر سوم میں مذکور ایک قصے کا سہارا لیتا ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ نے اپنا حال یوں بیان کیا کہ میں انسان میں انوارِ محبوب یعنی قطرے میں سمندر اور سورج کو ذرّے میں دیکھ لوں۔ میں ایک ساحل پر پہنچا تو شام کا وقت تھا۔ میں نے سات شمعیں روشن دیکھیں، پھر اچانک دیکھا کہ وہ ساتوں ایک ہوگئیں، پھر دیکھا کہ وہ دوبارہ سات میں تقسیم ہوگئیں ہیں۔ ایک لمحے کے لیے بے ہوش ہوگیا۔ اب جو آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ سات شمعیں سات انسان بن گئیں تھیں اور ان کا نور آسمان تک پہنچ رہا تھا۔ میں آگے بڑھا کہ غور سے دیکھوں یہ کیا ماجرا ہے، کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ساتوں شخص سات درخت بن گئے۔ جن پر پتّے اور پھل لدے ہوئے تھے۔ تعجب یہ کہ لوگوں کو نہ وہ شمعیں نظر آ رہی تھیں، نہ وہ شخص اور نہ وہ درخت۔ لوگ ادھر اُدھر سائے، آرام کی تلاش میں بھاگ رہے تھے اور مجھ پر ہنس

رہے تھے کہ یہ آدمی درخت اور پھل کہاں سے دیکھ رہا ہے۔ اب جو میں اور آگے بڑھا تو ساتوں درخت ایک درخت بن گئے۔ کبھی وہ سات بنتے کبھی ایک۔ پھر میں نے ان کو نماز کی حالت میں دیکھا اور پھر میں اس تعجب ہی میں تھا کہ درخت کہیں نماز پڑھتے ہیں کہ ان درختوں کو میں نے انسانوں کی شکل میں نماز پڑھتے دیکھا۔

اس کے بعد مولانا کشف اور وجود کے نکات بیان کرتے ہیں، لیکن یہ پوری طرح واضح نہیں کرتے کہ یہ کیا اسرار تھا۔ مولوی بحر العلوم نے اپنی شرح مثنوی میں واضح کیا ہے کہ وہ سات اشخاص ابدال ہو سکتے ہیں اور ان کی مختلف شکلیں ان کے وجود کے علامتی اشارے ہیں۔ مولوی بحر العلوم نے شیخ ولی محمد کی اس شرح کو قبول نہیں کیا ہے کہ دراصل یہ سات اسمائے الٰہی ہیں جو مختلف صورتوں میں اپنا ظہور کر رہے ہیں، لیکن غور سے دیکھیے تو شیخ ولی محمد کی بات دل کو لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا یہاں ہر شے میں نور وجود کی کارفرمائی دیکھ رہے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ اسے وحدت الوجود ہی فرض کیا جائے۔ صوفیوں کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ہر شے ذی روح ہوتی ہے۔ مولانا نے بھی اس قصے میں اس طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ کسی شے کو مردہ نہ فرض کرتا اور اسے زبانِ حال سے گویا سمجھنا اور ہر شے کو ارادۂ الٰہی اور اس طرح ارادہ، انسان کامل کا تابع سمجھنا ایک مشہور صوفیانہ مسئلہ ہے۔ تصوف کی کارفرمائی حسن نظامی کے یہاں محض عارفانہ مضامین میں نہیں ہے بلکہ بالخصوص اس بات میں ہے۔ وہ ہر شے کو ذی وجود یا کم سے کم ذی روح سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جانوروں، کیڑے مکوڑوں، بلکہ دنیا کی ہر چیز سے گفتگو کر کے، اس کی گفتگو بیان کر کے اور اسے اپنا مخاطب یا ہمنشیں قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ صوفیانہ دماغ سے زیادہ وہ صوفیانہ آنکھ سے کام لیتے ہیں یہی ان کا راز ہے۔ ○○○

سی پارۂ دل

مصورِ فطرت شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

۱۱۳۲ لیبلے مضامین کا دلکش مجموعہ

اردو میں اب تک دس ایڈیشن شائع ہونے کے بعد اب اسے

ہندی رسم الخط

میں بھی شائع کر دیا گیا ہے

بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق ''ان مضامین میں خواجہ صاحب کسی سے باتیں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، کہیں وہ اپنے سے ہم کلام ہیں، کہیں راز و نیاز ہے،..... کہیں نثر میں وہ شاعری کی شان دکھائی ہے کہ نظم مقفیٰ ہیچ ہے، کہیں ذرّے کو آفتاب بنایا ہے اور کہیں آفتاب کو خاک۔ غرض عجیب گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ کے پھول اور ہر پھول میں نئی خوشبو ہے۔''

سی پارۂ دل اپنی انہی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے لگ بھگ ایک صدی سے ہائی اسکول سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل چلی آ رہی ہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں دستیاب۔

ملنے کا پتہ

خواجہ حسن ثانی نظامی

خواجہ ہال، بستی حضرت نظام الدین اولیاء، نئی دہلی۔۱۳

شمس العلماء مصور فطرت

حضرت خواجہ حسن نظامی علیہ الرحمہ والغفران

کی تصنیفات کے سب حالیہ شائع شدہ ایڈیشن

مہیا ہو گئے ہیں۔ ضرورت مند حضرات طلب

فرما سکتے ہیں (حسن ثانی نظامی)

© https://www.KhwajaHasanNizami.life

خواجہ حسن نظامیؒ کی دعائیں
ایک نئی جہت

پروفیسر اختر الواسع

دُنیا کے ہر مذہب میں 'دُعا' کی روایت اس کے آغاز سے چلی آرہی ہے۔ اہل دل نے دُعا کو مذہبی زندگی کی رُوح قرار دیا ہے اور اصحابِ ظاہر کے نزدیک بھی مذہب کی عملی شکل کا اظہار و انحصار بڑی حد تک دُعا پر ہے۔ دعا کے ذریعہ گوہر مقصود کو پانا اور خود انبیاء و مرسلین کا اپنے رب سے دُعا مانگنا اور ان کا قبول ہونا قرآنِ مجید میں مذکور ہے۔

دُعا پکارنے کو کہتے ہیں اور اسلامی اصطلاح میں دعا سے مراد وہ پکار ہے، جو بندہ اپنے رب کے حضور بلند کرتا ہے۔ دُعا کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے انسان فطرتاً فقیر و محتاج ہے، جبکہ ذاتِ باری تعالیٰ غنی و بے نیاز اور اس فقر و محتاجی ہی کی وجہ سے انسان دُعا کے لیے مجبور ہے۔ سورۂ مومن میں ارشاد ربانی ہے کہ ''مجھ سے دُعا کرو، میں تمھاری دُعا قبول کروں گا۔'' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''دُعا مومن کا ہتھیار، دین کا ستون اور آسمان و زمین کا نُور ہے۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''دُعا عبادت بھی ہے اور عبادت کا مغز بھی۔''

صوفیائے کرام کے یہاں دُعا ایک مستقل 'انسٹی ٹیوشن' کی حیثیت اختیار کرگئی۔ ان کے حضور اور غیاب میں ان کے توسط اور توسل سے دُعا کا چلن عام رہا ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ خود صوفی تھے، اس لیے ان کے یہاں بھی دعا کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اتفاق بھی کم دلچسپ نہیں کہ ان کے عہدِ طفلی کی سب سے پہلی تحریر ''مفلسی کا علاج بذریعہ دُعا'' نامی رسالہ ہے، جو غالباً ۱۹۰۰ء میں پہلی بار شائع ہوا اور ۱۹۲۵ء تک اس کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اس میں مولانا جلال الدین السیوطیؒ کے عربی رسالہ ''حصول الرفق بوصول الرزق'' کا اردو ترجمہ ہے اور اس پر خواجہ صاحبؒ نے حواشی بھی لکھے ہیں۔ یہ ان دعاؤں کا مجموعہ ہے، جو ''رزق کی تنگی'' اور ''معاش کی عُسرت'' کو دُور کرسکیں۔ اس کے علاوہ خواجہ صاحبؒ نے ''اُردو دعائیں'' کے نام سے بھی ایک رسالہ مرتب کیا، جس میں ''اللہ تعالیٰ سے ہر مراد اُردو زبان میں مانگی گئی ہے۔'' اس رسالہ میں ''صحیح حدیثوں میں آئی ہوئی عربی دعائیں بھی'' اُردو میں جمع کردی گئی ہیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں خواجہ صاحبؒ کی شخصیت بڑی رنگارنگ، ہمہ جہت اور مرتب و متوازن تھی۔ ان کی ذات کے جلوۂ صد رنگ سے مذہب، تصوف، ادب، معاشرت، سیاست و صحافت اور تجارت و سیاحت کی ہر انجمن میں روشنی رہی۔ انھوں نے اپنے 'افکارِ تازہ' سے ہمارے ادب میں نہ جانے کتنے 'جہان تازہ' آباد کیے۔ انھوں نے تخیل اور تصور کی گلکاری سے قوسِ قزح کی سی دلکشی و دلآویزی اپنی تحریروں میں پیدا کردی۔ انھوں نے بھاری بھرکم اور ادق فلسفیانہ مسائل کو اپنے جذبات کی شدت سے اس طرح موم کیا کہ عوام و خواص سب کی روح کو گرمایا اور دل کو تڑپایا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے خواجہ صاحبؒ، کثیر الاوصاف شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مرید بھی تھے اور مراد بھی، صوفی بھی تھے اور صحافی بھی، دین دار بھی تھے اور دنیادار بھی، ادیب بھی تھے

© https://www.khwajahasannizami.life

اور تاجر بھی، مقلد بھی تھے اور غیر مقلد بھی، وہ کفر مسلمان بھی تھے اور وسیع المشرب انسان بھی۔ وہ دعا گو بھی تھے اور دعا جو بھی۔ ان کی دعاؤں میں جو دلسوزی اور حضوری کی کیفیت پائی جاتی ہے، اُردو میں اگر دعائیہ لٹریچر کا کوئی باب ہوتا تو اس میں خاصے کی چیز مانی جاتی۔ ان کی دعاؤں میں 'درد تنہا' کی نہیں بلکہ 'غم زمانہ' کی نمائندگی ہے۔ انفرادی دُعا میں بھی اجتماعی مفاد کا خیال غالب ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان میں انسان کی ضرورت مندی کے ساتھ ہی ساتھ عصری حسیت، تاریخی شعور، حب الوطنی، تلمیحات، مذہبی علامات اور دینی شعار سب کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔

خواجہ صاحبؒ اپنے رب کے ساتھ تعلق میں نہ تو حالی کے پیرو ہیں کہ اُف بھی نہ کریں اور نہ اقبال کے ہم مسلک کہ شکوہ و شکایت پر اُتر آئیں۔ قرآن مجید میں حکم ہے کہ دعا میں عاجزی و انکساری سے کام لینا چاہیے اور اللہ کو اس کے اچھے ناموں سے پکارنا چاہیے۔ خواجہ صاحبؒ اپنی دعاؤں میں اس کا خیال کس حد تک رکھتے ہیں دیکھیے:

"بجلی میں چمکنے والے، چاند میں جھلکنے والے، رات کے اندھیرے، سورج کی روشنی، آسمان کی بلندی، دریا کی روانی، جنگل کی سنسانی دلگیری و دلداری کے مالک! عرش کی اقامت میں خُدا، دل کے گھرانے میں خُدا! ہم تیرے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہے، ہم کو سربلند کر، فرش میں ہے تو وسعت و ثابت قدمی عنایت فرما، دل میں ٹھکانا ہو تو اس کو اپنے رہنے کے قابل بنادے، رگِ جان میں ہو تو خون میں اپنی شان اور آن بان کا جوش پیدا کر، اگر تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچادے۔"

خواجہ صاحبؒ، انسان کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کا عرفان رکھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ یہ اشرف المخلوقات زمین پر خدا کا نائب ہے۔ ایک نائب کی حیثیت سے اپنے آقا کے حضور اپنی عرضی اس طرح گذارتے ہیں کہ اس کی شان ربوبیت انسان کے اظہار عبودیت دونوں کو مراد ہو۔ دعا کے اس انداز میں 'ایاک نعبد و ایاک نستعین' کی تفصیل دیکھیے:

"تو عالم ہے، اپنے علم کا حصہ ہم کو بھی دے۔ رازق ہے، ہمارے ہاتھوں سے رزق بانٹ۔ رحمٰن ہے، رحمت نازل فرما۔ قہر و جبر کی تلوار ہمارے دشمنوں کے ہاتھ میں نہ دے۔ خیر کو وسعت دے کر شر سے بچا۔ ہماری آنکھ بن، تجھ سے دیکھیں۔ کان بن، تجھ سے سُنیں۔ زبان میں تو ہی بول، ہاتھ سے تو ہی کام کر۔ تو بعید ہے، تو قریب آجا، قریب ہے تو اقرب ہو جا۔ اقرب ہے تو حجاب اقرب کا حجاب بھی اٹھادے۔"

تصوف میں عشق الٰہی کو محور کی حیثیت حاصل ہے اور عشق کیا ہے؟ حالتِ ہجر میں کیفیت اضطراب، برہا میں بیاکل ہونے کو ہی تو عشق کہتے ہیں۔ جب آرزوئے وصال اور دید کی تمنا ہی متاعِ حیات بن جائے تو اُس کو معراجِ عشق کا درجہ دیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحبؒ کی دعاؤں میں اس رنگ کو بھی دیکھیے:

"آ — خوشی بن کر آ، غم میں سما کر آ، مگر آ، عید کے چاند میں آ، محرم کے ہلال میں نظر آ، چمک میں، جھلک میں، تاریکی میں لہریں لے کر، کڑک کے دل ہلا، لیکن اے آنے کے قابل آ۔ کہتے ہیں تو ہر چیز میں آسکتا ہے۔ ہر حال میں تیری آمد کا امکان ہے۔ تیرے آنے میں دیر نہیں لگتی۔ تجھ کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ آئے بغیر جو آجائے، بلا حرکت متحرک ہو۔ وہ تو ہے۔ تو بس اسی طلسماتی، غیر مفہوم چال سے آجا۔ دیکھ آجا، سُن آجا، سمجھ آجا۔ ہم کو وہ دیدار دے جو دیدۂ دیدار طلب کے شایاں ہو۔ موسیٰ کو بے ہوش کرنے والا، طور کو خاک سیاہ بنانے والا نہیں۔"

برہا کی رُت میں بیاکل من کی بنتی دیکھیے اور ساتھ ہی ساتھ گنگا جمنی زبان کا چٹخارہ بھی لیجیے:

© https://www.khwajahasanNizami.life

''داتا تو کہاں ہے؟ من کی بپتا کے دیکھن ہار،
مولیٰ، مولیٰ، سُن الجھنوں میں ہوں، گردشوں میں ہوں۔
بے قراری دیکھ، آہ وزاری دیکھ، اشکباری بھی..... یہ رات
کیوں کر کٹے۔ تو یاد آتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اپنے داس کو
درشن دے، روپ دکھا۔ جلوہ افروز ہو۔ آنکھ بیہوش اور من
سنتوش ہو۔ کس کا بلقان، کیسا ایران، تیری رحمت کا چشمہ اور
اس میں اشنان، اسی میں ہیں دونوں جہان۔ رین اندھیری،
بدلی کالی، رستہ بھاری، دشمن سر پر، غفلت دل میں، ہاتھ پکڑ
بھگوان.....۔

.....سر ہے حاضر، کھنچے کٹاری، عشق کی اگنی چتا
ہماری، ست پکاریں ست بن جائیں، جزو کو تیاگیں کل
ہو جائیں، یثرب پہنچیں، مکہ دیکھیں، بیچ سمندر جھنڈا گاڑیں
.....تو ہو بس میں، سب ہوں بس میں، حسن نظامی کس کا
بندہ؟ وقت کٹھن ہے، اٹکا پھندہ۔ بھگتی اپنی من کو دے،
بھارت سیوا سب کو دے، بس میں آ بھگوار، تیرے نام کو
پرنام یاذی العزۃ والجبروت والاکرام۔''

بیت المقدس کے سفر کے موقع پر ۶ر جولائی ۱۹۱۱ء کو خواجہ صاحبؒ نے حضرت زکریا کی محراب میں حاضری کے وقت جو دُعا مانگی، اس کا ایک اقتباس دیکھیے:

''زکریاؑ کے رب! اپنے بندے کی ندا کو رحمت سے سننے والے خدا! جب زکریاؑ نے اس محراب میں بیٹھ کر تجھ سے کچھ مانگا تو تیرے قول کے مطابق چپکے سے مانگا، جس کو تو نے سن لیا اور زکریاؑ کے دامن مراد کو گوہرِ مقصود سے بھر دیا۔ بتا کہ میں ندائے خفی سے پکاروں یا صدائے جہر لگاؤں۔ زکریاؑ عمر میں بوڑھے تھے اور میں قویٰ کے اعتبار سے ضعیف۔ زکریاؑ کو اپنی بیوی کے بانجھ ہونے کی شکایت تھی اور مجھ کو اپنی قوم کے بانجھ ہونے کا شکوہ ہے۔ یعنی اس سے نمو کی صفت مفقود ہو گئی ہے۔''

دعاؤں کی صورت میں گداز قلب کی دولتِ بیدار کے یہ تو چند نمونے تھے، جو یہاں پیش کیے گئے، ورنہ 'سی پارۂ دل' میں تو پہلی منزل ہی عبد و معبود کے راز و نیاز کی ہے۔ جس میں حروف کی دُعائیں بھی ہیں اور موسمی دعائیں بھی۔ آنسو بھری آنکھ کی التجا بھی ہے اور بندوں کی دُعا بھی۔ جس میں تمام دنیوی و دینی حاجات کے لیے رب العالمین کی طرف رجوع کیا گیا ہے، لیکن یہاں خواجہ صاحبؒ کے تصورِ دُعا کے بارے میں ایک حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ان کا حرکت میں برکت پر ایمانِ راسخ تھا، اس لیے وہ دعائے محض کے قائل نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''آج کل اکثر مسلمان کاہل وجود ہو گئے ہیں۔ ان سے محنت اور کوشش نہیں ہو سکتی اور محض یہی دعائیں پڑھ کر انتظار کرنے لگتے ہیں کہ غیب سے رزق آجائے گا اور خزانہ الٰہی سے دولت برسنے لگے گی۔ حالانکہ ان دعاؤں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان ظاہری محنت اور کوشش بھی کرے اور یہ دعائیں پڑھ کر پروردگار کی امداد و برکت بھی چاہے۔ محض اس بھروسہ پر نہ بیٹھا رہے کہ ان دعاؤں کی برکت سے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر روپیہ آجائے گا، قرضہ اتر جائے گا اور مفلسی دور ہو جائے گی۔

میں اس قسم کے نکمے، سست اور بیکار مفلسوں سے تنگ آ گیا ہوں جو رات دن صرف وظیفے پڑھتے رہتے ہیں اور حلال روزی کمانے کے لیے ہاتھ پاؤں سے محنت نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''لیس للانسان الا ما سعیٰ'' انسان کو اس عالم اسباب دنیا میں کوشش کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔''

❖❖❖

© https://www.khwajahasannizami.life

۱۸۵۷ء اور خواجہ حسن نظامیؒ

پروفیسر شریف حسین قاسمی

سب سے پہلے میں خواجہ حسن ثانی صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ آپ نے حضرت خواجہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ کی ۱۸۵۷ء سے متعلق بارہ مختلف اور تاریخی اہمیت کی حامل کتابیں ایک ہی جلد میں دیدہ زیب ٹائٹل اور خوشنما خط میں شائع فرمادی ہیں۔ یہ ایک بڑا اور ضروری کام تھا جسے آپ نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں قلعۂ معلیٰ اور دہلی میں کیا کیا حوادثات رونما ہوئے، ان کی مفصل گزارش ان بارہ کتابوں میں محفوظ ہے۔

خواجہ حسن نظامی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی زندگی مختلف خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ خود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اپنے چشتی نظامی سلسلے کی ترویج ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ اپنے سلسلے کو تاریخی اور حقیقی تناظر میں پیش کرنا، ان کا اولین مقصد تھا۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے آپ نے انتھک کوششیں کیں۔ ہندستان کے چپے چپے کا دورہ کیا اور آپسی بھائی چارے کا پرچار کیا۔ اسلام اور مسلمانوں پر اغیار کے بے بنیاد حملوں اور اعتراضات کا مناسب اور موثر جواب دیا۔ ان کی کتابوں اور دیگر تحریروں کی ضخامت پر نظر ڈالیے تو احساس ہوتا ہے کہ عمر بھر انھوں نے کبھی قلم ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور کبھی کچھ بھی بے مقصد نہیں لکھا۔ اصلاح معاشرہ ان کے لیے سب سے اہم کام تھا اور اس کے لیے تعلیم ان کی نظر میں اولین وسیلہ تھا۔ جلسوں اور جلوسوں میں شرکت کرنا اور بے خوف وخطر اپنی بات کہنا، صاحبان اقتدار سے بہتر تعلقات برقرار رکھنا تاکہ ضرورت مندوں کی مشکلات کے رفع کرنے میں کبھی ان کے تعاون کی ضرورت پڑے تو ان سے کام لینے میں آسانی ہو۔ خواجہ صاحب کا روزنامچہ پر جسے حضرت خواجہ حسن ثانی صاحب منادی میں ایک عرصے سے قسط وار شایع کررہے ہیں، نظر ڈالیے تو پتا چلتا ہے کہ ہر روز بڑی تعداد میں عام وخاص لوگ ان کے پاس آتے اور اپنی مشکلات بیان کرتے اور آپ بے دریغ ان کی مدد و راہنمائی کے لیے وہ سب کچھ کرتے تھے، جو مقدور تھا۔ بڑی تعداد تھی دلّی میں ان کے احباب کی۔ ان سے ملنا جلنا اور دوستانہ محفلوں کو اپنی حاضر جوابی اور شگفتہ بیانی سے گل گلزار بنانا، ہر طبقے کے لوگوں سے، خواہ وہ ان کے مکتب فکر کے حامی ہوں یا مخالف، تعلقات استوار رکھنا، مزید برآں اپنی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے کسی بھی قسم کے کام سے دریغ نہ کرنا اور اس کا عملی ثبوت بہم پہچانا، یہ تھیں حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم کی رات دن کی مصروفیات۔

دلّی ان کا وطن تھا، اس سے ٹوٹ کر محبت کرنا ان کے ایمان کا جز تھا۔ وہ دہلی کی قدیم وجدید تاریخ سے کما حقہ واقف تھے۔ دلّی نے اپنی عظمت ومرکزیت کو قائم ودائم رکھنے کے لیے کیا کیا قیمتیں ادا کی تھیں، وہ اس سے پوری طرح آشنا تھے۔ ۱۸۵۷ میں اس دلّی اور دلّی والوں پر جو قیامت صغریٰ قائم ہوئی، اس نے خواجہ صاحب کو تڑپا دیا تھا۔ ہزاروں لوگوں کے قتل عام اور بے شمار لوگوں کی بربادی اور بے آبروئی نے خواجہ صاحب مرحوم کو خون کے آنسو رلایا تھا۔ ان کے بزرگوں، خاص طور پر ان کے نانا حضرت شاہ غلام حسن چشتی نے انھیں بہادر شاہ کے دربار، ان کے خاندان کی بربادی اور ہلاکت، اور دلّی کی تباہی کے جو دردناک چشم دید حالات بتائے تھے، اس کی کسک خواجہ صاحب کی ان بارہ

کتابوں میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے نانا کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''میرے نانا حضرت شاہ غلام حسن چشتی سے بہادر شاہ کو دوستانہ عقیدت تھی۔ نانا صاحب اکثر قلعہ میں جاتے اور بہادر شاہ کی خاص خلوتوں میں شریک ہوتے تھے۔ میری والدہ ماجدہ بہادر شاہ کے صدہا قصے اپنے پدر بزرگوار حضرت شاہ غلام حسن چشتی کی زبانی بیان فرمایا کرتی تھیں، جن کو سن کر بچپن میں جب کہ بہادر شاہ کی عظمت وشان کی کچھ سمجھ اور خبر نہ تھی، خود بخود متاثر ہوتا تھا اور دل پر دنیا کی بے ثباتی کے نقش جمتے تھے۔''

مزید برآں، جیسا کہ حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے لکھا ہے:

''خواجہ حسن نظامیؒ نے ہوش سنبھالا تو ایسے لوگ کثیر تعداد میں موجود تھے، جنھوں نے ۱۸۵۷ کی دار وگیر کو بھی بھگتا اور سہا تھا۔''

خواجہ حسن نظامیؒ نے ۱۸۵۷ اور خاص طور پر قلعۂ معلیٰ سے متعلق اپنی بارہ کتابوں میں ان ذرائع سے حاصل ہونے والی اطلاعات کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ صاحب کی ان کتابوں میں زیادہ تر انہی شخصی ذرائع معلومات کی کارفرمائی نظر آتی ہے، جن کا اسی نوعیت کی دوسری کتابوں میں پایا جانا، ظاہر ہے، خارج از امکان ہے۔

ایک اہم بات اور عرض کردی جائے کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے شاہی خاندان کے بے شمار افراد اور متوسلین کا ذکر کیا ہے۔ بہادر شاہ کی بیگمات، لڑکوں، بیٹیوں، ان کی آس اولاد اور ان کے خدمتگاروں کے احوال لکھے ہیں۔ یہ اطلاعات ظاہر ہے اسی کو حاصل ہوسکتی تھیں، جو قلعہ معلیٰ سے نزدیکی تعلقات رکھتا ہو، اور وہ تھے خواجہ حسن نظامی مرحوم کے نانا، نہ صرف یہ بلکہ شاہی خاندان کے افراد جب قلعے سے نکال باہر کردیے گئے تو دلّی اور دلّی سے باہر جس کا جہاں سینگ سمایا چلا گیا۔ کچھ لوگ درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ میں بھی پناہ گزیں ہوگئے۔ ان سب ہی نے اپنی اپنی بپتا سنائی ہوگی، جس کی سُن گُن خواجہ حسن نظامی تک بھی پہنچی اور وہ آپ نے اپنی مختلف کتابوں میں ان کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کردیا۔ قلعہ معلیٰ کی سماجی زندگی کا جو نقشہ خواجہ صاحب کی ان کتابوں میں کھینچا گیا ہے، وہ بھی کم اہم نہیں، یہ خاصہ کی چیز ہے۔

۱۸۵۷ کی مکمل تصویر کشی کے لیے خواجہ صاحب نے غالب دہلوی کی اس دور کی گذارش دستنبو کا اردو خلاصہ، انگریزی اور فارسی میں بعض اسناد اور سرکاری کاغذات کا اردو ترجمہ بھی اپنی کتابوں میں شامل کیا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ کی ''تاریخ ہند'' سے بھی، خواجہ صاحب نے جہاں سامراجیوں کے ہاتھوں دلّی اور دلّی والوں پر مظالم کا ذکر کیا ہے، وہاں آپ نے بعض انگریزوں پر ہونے والی تجاوز کاریوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور اس طرح کوشش کی ہے کہ ۱۸۵۷ کے حالات کی عین مناسب اور متوازن تصویر پیش کردی جائے۔ خواجہ صاحب اس کام میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کے ایک بیان سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ سے بہت بعد تک اس سانحہ کی ہندستان میں اور ہندوستانیوں کے ذریعہ تاریخ لکھنا خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ سامراجی اسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اس لیے کہ مورخ جتنا بھی محتاط ہو، انگریزی مظالم کے بیان کرنے سے خود کو روک نہیں سکتا تھا، چپے چپے پر سامراجی بربریت کے نقوش اور ہندستانی بے گناہ قوم پرستوں کے خون کے چھینٹے اس کی حتی بند آنکھوں کو بھی نظر آتے تھے۔ خواجہ صاحب نے لکھا ہے:

''میں نے آج سے چالیس سال پہلے جب یہ تاریخ (یعنی انگریزوں کی بپتا) لکھنی چاہی تو خوف کی یہ

حالت تھی کہ ہر شخص مجھ کو ڈرانا تھا کہ جو قلم کار ایسی تاریخ لکھے گا، پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا، مگر میں انگریزوں کی آزاد خیالی کو جانتا تھا، اس لیے میں نے جرأت کر کے یہ تاریخ لکھ دی اور شروع کی چند مشکلات کے سوا کوئی تکلیف مجھے یہ تاریخ لکھنے کی وجہ سے انگریز حکومت نے نہیں دی۔"

خواجہ صاحب کو غم انگیز واقعات بیان کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب یہ واقعات انھوں نے لکھے ہوں گے تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے ہوں گے، اسی وجہ سے انھیں پڑھنے والے کی آنکھیں بھی نمناک ہو جاتی ہیں۔ بیگمات کے آنسو ایسے ہی قصوں کا مجموعہ ہے، جو خود مصنف کے بقول: "محض میری ذاتی تحقیقات سے تیار ہوا ہے۔" خواجہ صاحب نے بہادر شاہ ظفر کی ایک بیٹی کلثوم زمانی بیگم کی زبانی یہ عبرتناک واقعہ بیان کیا ہے:

جس رات میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت لٹنے کا وقت قریب آیا تو دلّی کے لال قلعے میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ در و دیوار پر حسرت برستی تھی۔ اجلے اجلے سنگ مرمر کے مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے۔ تین وقت سے کسی نے کچھ نہ کھایا تھا۔ زینب میری گود میں ڈیڑھ برس کی بچی تھی اور دودھ کے لیے بلکتی تھی۔ فکر اور پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا نہ کسی انا کے۔ ہم سب اس یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے کہ حضرت ظل سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا۔ آدھی رات کا وقت، سناٹے کا عالم، لوگوں کی گرج سے دل سہمے جاتے تھے، لیکن حکم سلطانی ملتے ہی، حاضری کے لیے روانہ ہو گئے۔ حضور قصر پر تشریف رکھتے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں تھی، جب میں سامنے پہنچی اجھک کر تین مجرے بجالائی۔ حضور نے نہایت شفقت سے قریب بلایا اور فرمانے لگے: "کلثوم! لو اب تم کو خدا کو سونپا، قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے۔ تم اپنے خاوند کو لے کر فوراً کہیں چلی جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔ جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں، پر کیا کروں، ساتھ رکھنے میں تمھاری بربادی کا اندیشہ ہے، الگ رہو گی تو شاید خدا کوئی بہتری کا سامان پیدا کر دے۔"

کیا بے دست و پائی ہے اس فرمانروا کی جس کے بزرگوں نے نہایت شان و شوکت اور جاہ و جلال سے ہندستان پر حکومت کی تھی۔

"غدر کے فرمان" نام سے جو حصہ اس مجموعہ میں شامل ہے، اس کا بیشتر حصہ انگریزی میں "ٹرائل آف بہادر شاہ" سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ غالباً اس کتاب کے بعض حصوں کا یہ سب سے پہلا اردو ترجمہ ہے۔ خواجہ صاحب نے اس حصے کے اوائل میں یہ بتا دیا ہے کہ:

"پہلے خطوط اردو یا فارسی میں تھے۔ مقدمے (یعنی بہادر شاہ کے مقدمے) کی ضرورت سے انگریز وکیل نے ان کا انگریزی ترجمہ کرایا، تاکہ انگریز جج ان کا مطلب سمجھ سکیں۔ اس زمانے میں ایسے لوگ کمیاب تھے جو فارسی یا اردو کا صحیح مفہوم انگریزی میں ادا کر سکیں، اس لیے ممکن ہے کہ مترجم نے کچھ غلطیاں کی ہوں، اس کے بعد اب انگریزی سے اردو ترجمہ کرایا گیا ہے، جس میں مزید غلطیوں کا ہو جانا، کچھ بعید نہیں ہے۔"

دستاویزات خطوط کے انھی اشتباہات سے پُر اور نامکمل تراجم کی بنیاد پر بہادر شاہ کے مقدمے کا فیصلہ ہوا۔ انھیں جلاوطن کر دیا گیا، جہاں وہ جاں بحق ہوئے۔

خواجہ صاحب دلّی والے تھے اور دلّی کی سماجی، اخلاقی اور ادبی روایات کے امین۔ آپ نے دلّی والوں کی ایک خصلت کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

© https://www.khwajaatamirani.life

دہلی شہر کے باشندوں کی یہ خصلت تمام ملک میں نرالی ہے کہ وہ غم اور مصیبت کے وقت بھی تفریح اور خوش باشی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انگریزوں نے جب شہر پر گولہ باری شروع کی تو بجائے اس کے کہ باشندے خائف ہوتے یا گھبرا کر بھاگتے، شب برأت کی آتش بازی کی طرح توپوں کے گولے ان کے لیے مذاق وتفریح کا ایک تماشا ہوگئے۔ مکانوں کی چھتوں پر لوگ چڑھ جاتے اور گولوں کی سیر دیکھتے اور جب گولے شہر کی طرف آتے تو بے تحاشا غل مچاتے، وہ آیا، وہ آیا، دیکھو وہ ادھر چلا، آہا! وہ گرا، وہ پھٹا۔ جس جگہ گولہ گرتا، وہاں سینکڑوں آدمیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ گولے کچھ اس قسم کے تھے کہ ان سے کچھ زیادہ نقصان نہ ہوتا تھا۔ شہر کی سڑکیں چوڑی تھیں، مکانوں کے صحن بھی فراخ تھے، باغات کی کثرت تھی، اس واسطے گولوں سے زیادہ نقصان نہ ہوتا تھا.....

اس کے بعد خواجہ صاحب دلّی والوں کے اس رویّے کی وجہ بتاتے ہیں کہ:

''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی یہ خصلت کیسی عجیب ہے۔ یا تو وہ وجہ تھی کہ صدمے اٹھاتے اٹھاتے ان کے دل سخت ہوگئے تھے اور یا خدا نے دہلی والوں کو دل ہی ایسا دیا ہے جو کسی وقت بھی تفریح اور خوش باشی سے خالی نہیں رہتا۔''

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ۱۸۵۷ کے بارے میں اپنی بارہ کتابوں کی تالیف، تدوین اور تصنیف سے متعلق اپنے رویّے کی خود ہی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''میری نیک نیتی اس سے ظاہر ہوسکتی ہے کہ میں نے بہادر شاہ بادشاہ کے بعض ذاتی افعال کی نسبت بھی نکتہ چینی کی ہے..... اگر میں یہ کتاب لکھتے وقت مؤرخانہ حیثیت کو چھوڑ دیتا تو بادشاہ اور ان کے خاندان کی کسی بات پر نکتہ چینی نہ کرتا، بلکہ میں نے تو اپنے بزرگوں کے خلاف بھی نکتہ چینی کی ہے، جبکہ میرے بزرگوں نے بادشاہ کے پاس جاکر اپنا خواب سنایا اور نذرانہ وصول کیا تھا۔ پس میرے جس قدر نوٹ ہیں، سب نیک نیتی سے لکھے گئے ہیں اور میں اس لہجے پر متاسف نہیں ہوں، جو میں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کی بعض غلطیوں کے خلاف استعمال کیا ہے، کیوں کہ ان کا طرز عمل ایک بڑے ہنگامے اور خونریزی کا باعث ہوا، جو ۱۸۵۷ میں پیش آیا۔''

مختصر یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے ۱۸۵۷ کے بارے میں یہ رسالے اور کتابیں، اس دور کی سماجی، سیاسی اور عسکری تاریخ کے گوناگوں پہلوؤں کی وضاحت وتشریح پر ایک قابل قدر اور دلچسپ سند ہے، جس کو ایک بار پڑھنا شروع کردیجیے تو ختم کرنے سے پہلے اسے ہاتھ سے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ □□□

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا فرمان
بابت
سماع — وجد — رقص
(قول وقوالی)
ایک ایسی رہنما دستاویز جس میں سماع، وجد اور رقص کے سلسلے میں اپنے محبوب سے دلی لگاؤ کے عاشقانہ اظہار پر اٹھنے والے مبینہ اشکال واعتراضات کا واضح اور شافی جواب موجود ہے
کہ کن شرائط کے ہوتے ہوئے سماع یعنی قول وقوالی جائز ہے
ناشر
خواجہ حسن ثانی نظامی

© https://www.khwajahasanzamani.life

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ
کا سفرنامہ حجاز مصر فلسطین شام ولبنان

پروفیسر سید محمد اجتباء ندویؒ

دیارِ عرب کے شوق دید نے کتنے لوگوں کے دل جگائے اور ان میں ولولے اور حوصلے پیدا کیے۔ بہت سارے سفرنامے مرتب ہوئے، جن سے وہ قلب ونگاہ بھی تسکین پاگئے، جو شرف زیارت سے محروم رہے، لیکن ہمارے حضرت خواجہ صاحبؒ کے سفرنامے کا رنگ ہی کچھ اور ہے، یہ سیر وسیاحت ہے، روزنامچہ ہے، علم وادب ہے، حسن نگارش اور جمال آرائی کا پیکر ہے، درد وسوز اور آنسوؤں سے لبریز بھی ہے۔ ہے تو بہت مختصر، اتنے بڑے اور تقدس مآب رقبہ کی روداد صرف ۱۹۱ صفحوں میں سمودی گئی ہے۔ اس ایجاز میں مسافر کے قلم کا اعجاز ہے، ادب کی چاشنی اور طرز نگارش کا البیلا پن جگہ جگہ عیاں ہے۔ پڑھنے والا "ھل من مزید" کی خاموش صدائیں دیتا ہوا ورق الٹتا جاتا ہے اور اس کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس درد وسوز میں گم ہوجاتا ہے، جو اس سفرنامہ کی میری نظر میں امتیازی خوبی ہے۔

اجتباء ندوی

سفرنامے کی ایک جھلک

۶/جون ۱۹۱۱ء: سہ شنبہ۔ کل عدن کی آمد ہے۔ اس لیے آج صبح سے خطوط نویسی شروع کی اور ۲ بجے تک فراغت۔ سمندر چپ چاپ۔ جہاز اس طرح جاتا ہے کہ حرکت محسوس نہیں ہوتی۔ آج تیسرے پہر میں نے تمام جہاز کا گشت لگایا۔ تھرڈ کلاس میں مسلمان زیادہ ہیں۔ کچھ عیسائی یعنی یورشین بھی ہیں۔ میرے خیال میں تھرڈ کلاس فرسٹ وسکنڈ سے لاکھ درجہ بہتر ہے بشرطیکہ دو چار آدمی رفیق وہم وطن بہم ہوجائیں۔ فرسٹ وسکنڈ کے کیبن گرمی میں دوزخ ہوتے ہیں اور عموماً رات کو ان کے مسافر بھی انہی تختوں پر آکر سوتے ہیں، جن پر تھرڈ کلاس والے رہتے ہیں۔ تھرڈ کلاس بڑی ہوادار اور آرام کی چیز ہے۔ سوائے اس کے کہ وہاں کے مسافر بشرطیکہ وہ ہندی اور خصوصاً مسلمان ہوں، قلی سمجھے جاتے ہیں اور ان کی کوئی توقیر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بات کچھ ایسی مہتم بالشان نہیں ہے۔ تقدیر نے اور جہالت وپست ہمتی نے ہم کو یورپ کے گھوڑوں کے پیروں میں روندنے کی گھاس بنادیا ہے۔ جب تک قسمت اُلٹی ہے، خوب پامال ہونا اور ٹھوکریں کھانا چاہیں۔

فرسٹ کلاس والے بھی اُسی وقت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں کہ یورپین لباس رکھتے ہیں۔ ورنہ اُن کی بھی کچھ قدر نہیں۔ میں اگرچہ سارے جہاز میں اکیلا ہوں کیونکہ غلام حیدر صاحب بسبب علالت باہر بہت کم آتے ہیں تاہم میں آج تک اس سفید جمگھٹے سے دب کر نہیں رہا۔ وہ تو مجھ کو چٹکیوں میں اُڑا ڈالتے، اگر بیباکی سے کام نہ لیا جاتا۔ آج شام کو عجیب اتفاق ہوا۔ ہوا خوری کے لیے چھت پر سب جمع تھے۔ جہاز کے ڈاکٹر صاحب نے میرے قریب آکر میرے باریک کپڑے کو کرتہ کو

گریبان کے پاس سے پکڑا اور کچھ آسٹرین زبان میں کہا۔ عورت و مرد سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ مجھے اس حرکت سے طیش آیا اور میں نے فوراً ڈاکٹر کے کوٹ کو وہیں گریبان کے پاس سے پکڑ کے کہا۔ خبیث اپنی آنکھ کا شہتیر بھی تو دیکھ۔ یہ کہا اور ہنس دیا۔ ڈاکٹر اور سب مجمع نے کھسیانی ہنسی میں بات کو ٹال دیا، مگر میرا فارسی داں فرانسیسی دوست بولا ''درفہم جناب عالی گفتار ڈاکٹر نیامدہ۔ او گفتہ کہ لباسِ حضرت بسیار سرداست۔'' میں نے جواب دیا ''بلے من گمان دارم کہ ڈاکٹر صاحب نیز گفتارم را در گوش ہوش نیاورد ند۔ من بجواب شاں گفتہ بودم کہ لباس شما خیلے گرم ہست۔'' اس کے بعد بات ہنسی میں پڑ گئی۔ القصہ ہم لوگ اُن کی نگاہ میں کبھی وقیع نہیں ہو سکتے جب تک کہ کلائی میں زور اور دماغ میں شعاع علم اور جیب میں روپیہ نہ بھر لیں۔ اٹھو میرے بھائیو! اور کوشش کر کے اپنی وقعت قائم کرو۔

تھرڈ کلاس کا کرایہ سوئیز تک (پچپن روپے) بغیر کھانے کے ہے۔ جتنا کرایہ میں نے ایک طرف کا فرسٹ میں دیا ہے (یعنی تین سو پچھتر روپے) اس میں پانچ آدمی آسانی کے ساتھ مع خوراک وغیرہ کے جا سکتے تھے۔ کاش ہندوستانی اٹھیں اور جماعتیں بن کر غیر ممالک میں جائیں اور ملک کا نام روشن کریں۔ مگر یاد رکھو صفائی تمھارے مذہب کا اولین فرض ہے۔ اس کی پابندی رکھنا۔ دیانت و صفائی کو بھی ہاتھ سے نہ دینا۔ پھر تم ہو اور سارے جہان کی عزت و حشمت۔

۷۔ جون ۱۹۱۱ء

چہار شنبہ۔ صبح ۷ر بجے عدن پہنچے۔ میری گھڑی میں دس بجے ہیں۔ کیونکہ میں نے اب تک دہلی کے وقت کو تبدیل نہیں کیا۔ مجھے اس کے برقرار رکھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ جب دیکھتا ہوں کہ ۹ر بج گئے اور سورج غروب نہیں ہوا تو عجب عجب خیالات آتے ہیں۔ اللہ کی قدرت اس وقت دہلی میں خاص کر منزل گاہ حلقہ میں لوگ کھانا کھا کر نماز عشاء کا سامان کر رہے ہوں گے اور یہاں ابھی سورج بھی نہیں چھپا۔ صبح طلوع بھی میری گھڑی کے حساب سے نو بجے ہوتا ہے۔ ممکن ہوا تو دہلی کے وقت کو سارے سفر میں قائم رکھوں گا۔

عدن کا جزیرہ دو گھنٹہ سے نظر آ رہا تھا۔ خشک پہاڑوں کا سلسلہ دریا میں پاؤں جمائے کھڑا ہے۔ جہاز نے لنگر ڈال دیا تو مجھے اُن سُمالی لڑکوں کی فکر ہوئی جو دریا میں غوطے مارتے اور کمپنی حرکات کر کے مسافروں سے پیسہ مانگتے ہیں جن کی مولانا شبلی نے بڑی ہجو کی ہے۔ اور جنھوں نے مولانا کو بہت اندوہگیں کیا تھا۔ مگر خدا کا شکر کہ مجھ کو وہ نظارہ پیش نہ آیا۔ بلکہ اس کے برخلاف دیکھا کہ سُمالی لڑکے تجارتی اسباب کی کشتیاں لے کر آئے اور جہاز پر چڑھ کر مال فروخت کرنا شروع کر دیا۔ ان کے پاس شتر مرغ کے انڈے تھے۔ مناظر عدن کے پوسٹ کارڈ تھے۔ یہ لڑکے سب زبانیں جانتے ہیں۔ اُردو بھی خوب بولتے ہیں۔ اہل یورپ سے دلیرانہ معاملہ کرتے ہیں۔ اور ہندی تاجروں کی طرح ذلت سے بازوؤں کو خم نہیں کرتے۔ نہ بے موقع اظہار انکساری میں دانت نکوستے ہیں۔ عدن میں جانے والے مسافروں کا ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو ہم بھی کھانا کھا کر اپنے یورپین ہم سفروں کے ساتھ عدن میں گئے۔ جہاز سے کنارہ تک کشتی کا چار آنے فی کس کرایہ مقرر ہے۔

پہلے خطوط ڈاک میں ڈالے۔ روز نامہ کی رجسٹری کے وقت بڑی دقت ہوئی۔ میں نے پتہ اردو میں لکھا تھا۔ بابو نے جو پونا کا برہمن تھا۔ انگریزی پتہ لکھنے کی خواہش کی۔ حیران ہوا کہ کس سے لکھواؤں۔ یورپین ہمراہیوں میں بھی کوئی شناسائے اُردو نہ تھا جو صحیح طور پر میرا تلفظ ادا کر سکتا۔ مایوس ہو کر بینچ پر بیٹھ گیا اور انگریزی کی ضرورت پر قصیدہ خوانی کرنے لگا۔ آخر قدرت

نے پرتگیز دوست مسٹر ڈیسوزا کو بھیجا۔ جن سے پتہ لکھوا کر رجسٹری روانہ کی۔ اس کے بعد تار میں بھی یہی دقت ہوئی۔

اتفاق سے مسٹر ڈیسوزا پھر ادھر آن نکلے اور تار کا کام پورا ہوا۔ عدن میں ڈاک کا حساب بالکل ہندوستان کے موافق ہے۔ یعنی ٹکٹ اسی قدر لگانے پڑتے ہیں جتنے ہندوستان میں، البتہ تار کا ایک روپیہ لفظ لیتے ہیں۔

اس کے بعد ہم نے مسٹر ڈیسوزا کی معیت میں ایک لینڈو گاڑی تمام عدن کے گشت کے لیے چار روپیہ میں کرایہ کی اور پھرنا شروع کیا۔

اگر دنیا میں کوئی ایسا شہر ہے جہاں درخت اور گھانس کی پتی تک نظر نہ آتی ہو تو وہ عدن ہے۔ چٹیل میدان، ہوحق، پہاڑ خشک پڑے ہیں۔ مکانات عموماً پست اور بدنما ہیں۔ یہودی یہاں کے تجارت کے سبب زیادہ خوش حال ہیں۔ یہاں ہندو بھی تجارت کرتے ہیں۔

عدن میں ایک اُردو کا مدرسہ ہے جو پُر جوش نوجوان سیّد حسین حُمود کے اہتمام میں خوب ترقی کر رہا ہے۔ ایک سَو سے زیادہ لڑکے پڑھتے ہیں۔ جن میں میمن، خوجے، عرب سب ہی ہیں۔ نصاب تعلیم انجمن حمایت اسلام کے طرز کا ہے۔ عبدالشکور صاحب ہندی پنشنر اس کے کارگزار مدرس اعلیٰ ہیں۔ پہلے یہ مدرسہ مہتمم صاحب کے بزرگوں کے مصارف پر چلتا تھا۔ اب انگریزی گورنمنٹ نے بھی چار سو روپیہ سال گرانٹ مقرر کیا ہے جس میں اُن کو اور بھی اضافہ کی امید ہے۔

دوسرا ایک مدرسہ عربی کا ہے جس میں عرب لڑکے زیادہ پڑھتے ہیں۔ اس کے مہتمم شیخ محمد عمر بارزع ہیں۔ اُس میں تیس کے قریب لڑکے پڑھتے ہیں۔ گورنمنٹ نے ابھی اس کا کچھ مقرر نہیں کیا۔

ایک اور مدرسہ انگریزی کا ہے جس کو ہائی اسکول کہنا چاہیے۔ اس میں سوا سو کے قریب لڑکے پڑھتے ہیں۔ عرب، یہود، سُمالی وغیرہ سب اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کے سب مصارف گورنمنٹ کے ذمہ ہیں۔

اب ہماری دل لگی کی کہانی سُنیے۔ عدن میں اتنے بزرگوں کے مزارات ہیں یہ وہ مزار ہیں جن کی عظمت مسلّم ہے اور دور دور سے لوگ ان کی زیارت کو آتے ہیں۔

(۱) سید عبدروس بن عبداللہؒ (۲) شیخ جوہرؒ (۳) شیخ ایان نبیرۂ حضرت امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ (۴) شیخ عبداللہ العلویؒ (۵) شیخ عبداللہؒ (۶) شیخ حسین احدلؒ (۷) احمد احدلؒ (۸) شیخ ہاشم بحرؒ (۹) شیخ عثمانؒ (۱۰) سید علی ابن احمدؒ۔

ان سب درس گاہوں میں سُرخ رنگ کے پھریروں کے جھنڈے نصب ہیں۔ جن پر ہلال بنا ہوا ہے۔

ان بزرگوں کے مفصل حالات کی کتاب عدن میں ملتی ہے۔ جس کے بھیجنے کا سید حسین حمود نے وعدہ کیا ہے۔ وہ آجائے گی تو سفرنامہ کی تکمیل کے وقت حاشیہ میں یہ حالات نقل کر دیے جائیں گے۔

زندہ مشائخ بھی کئی ہیں۔ مگر مجھ کو صرف سید محمد عبداللہ البار کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ بار سلسلہ نقشبندیہ کی ایک شاخ ہے، جس کے سر سلسلہ سید عمر بن عبدالرحمٰن البار تھے۔ اس سلسلہ کے ایک بزرگ مدینہ شریف میں بھی ہیں جن کا اسم گرامی سید البار صاحب نے مجھ کو لکھوا دیا ہے۔ سید البار صاحب پچاس سالہ بزرگ ہیں۔ بشرہ سے آثار بزرگی مترشح ہیں۔ نہایت سادگی سے ایک بوریہ پر عرب جماعت کے حلقہ میں بیٹھے تھے۔ اُن سے بہت دیر تک مترجم کے ذریعہ گفتگو رہی۔ کیونکہ یہ عدن کی عربی کے سوا اور کوئی زبان نہیں جانتے۔ ہندی مشائخ کے حالات دریافت کیے اور حلقۂ نظام المشائخ کا حال سُن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ مسلمانوں کو مضبوط کر کے موجودہ علوم ضرور

حاصل کرنے چاہییں تاکہ وہ اقوام غیر کے دوش بدوش زندگی بسر کرسکیں۔

عدن کو پورے چار گھنٹے گشت لگا کر خوب دیکھا۔ جگہ جگہ ٹھہر کر میں بچوں سے باتیں کرتا تھا۔ تعجب ہے کہ سب خوب اُردو بولتے ہیں۔ یہ عموماً سُمالی قوم کے ہیں۔ سُمالی مُلّا کے شاکی تھے کہ اس کو خوف خدا نہیں۔ ہمارا مال لوٹ لیا اور ہم کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ اُن کو اس کا بھی افسوس ہے کہ انگریزوں کی دوستی میں ہم نے یہ نقصان اُٹھایا، مگر انگریز خزانہ تھوڑ جانے کے سبب مُلّا کے سامنے سے بھاگ آئے۔ اور ہم کو درمیان میں چھوڑ دیا۔

میں نے کہا کہ نہیں انگریز ایسے غریب نہیں ہیں کہ ذرا سی بات میں اُن کا خزانہ کم ہوجائے، تو اُنھوں نے سوال کیا۔ آپ ہی بتائیے کہ پھر انگریزوں نے مُلّا کا مقابلہ کیوں چھوڑ دیا۔ اور مفتوحہ ملک کیوں خالی کر کے چلے آئے۔ اس قسم کے خیالات ان میں عام طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک بچہ کا میں نے نام پوچھا تو بولا نور۔ میں نے کہا تیرا رنگ تو اس قدر کالا اور نام ایسا سفید۔ ہنس کر کہنے لگا، کفرستان کے اثر نے نور کو کالا کر دیا ہے۔

جب ہم واپس آئے اور کشتی پر سوار ہوئے تو ملاح لڑکے نے ایک انگریز سے کہا۔ دونّی دریا میں ڈالو۔ میں نکالوں گا۔ چنانچہ انگریز نے دونّی ڈال دی اور وہ لڑکا فوراً غوطہ مار کر مُنہ میں نکال لایا۔ جب جہاز کے قریب پہنچے اور ملاح کو چار آدمی کی اُجرت کا ایک روپیہ ملا تو اُس نے نہایت متانت سے انگریزی زبان میں کہا۔ لو صاحب اب تم دریا میں کودو۔ میں یہ روپیہ پھینکتا ہوں۔ اس کو نکال لاؤ۔ صاحب اس کی بے باکانہ بات سے ہنسنے لگے۔

تیسرے پہر سید حسین حمود اور عبدالشکور صاحب جہاز پر ملاقات باز دید کے لیے آئے اور سلسلۂ نظامیہ میں بیعت کی خواہش کی۔ چنانچہ ان دونوں کو سلسلہ میں شامل کرلیا گیا۔

شام کو بعد مغرب جہاز نے لنگر اُٹھایا۔ آج عدن سے ایک یہودی تاجر فرسٹ کلاس میں سوار ہوا ہے۔ نوے برس کی عمر ہے۔ اور صورت بالکل (بالتشبیہ) سرسید احمد خاں کی ہے۔ میں حیران ہوکر اُس کو دیکھتا رہا۔ ترکی ٹوپی، کوٹ پتلون، سفید ڈاڑھی، بھاری آواز، وہی نقشہ۔ اس کے پہنچانے کے لیے اس کثرت سے یہودی آئے کہ سارا جہاز ترکی ٹوپیوں سے بھر گیا۔ یہ سب علیگڈھی لباس میں تھے۔ ان میں بعض صورتیں تو اس قدر نورانی اور متبرک تھیں کہ بے ساختہ تہجد گزاروں کا شبہ ہوتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے کانوں کے پاس ذرا گنجان بالوں کے گچھے تھے جو نوعمر لڑکوں کو بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ صورتیں ان سب کی گوری چٹی۔ ان کے لڑکے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ ابھی علیگڈھ سے آئے ہیں۔ فیشن ایبل جنٹل مین ہیں۔ یہ یہودی پورٹ سعید جاتا ہے۔ عدن کے اُمراء میں ہے۔

سُنا تھا کہ بحر احمر میں گرمی زیادہ ہوگی۔ اس لیے رات کو چھت پر سویا۔ مگر ہوا اس قدر تیز اور سرد تھی کہ ساری رات اس کے سناٹے نے سونے نہ دیا۔ ۳ بجے اُٹھ کر کیبن میں چلا آیا۔

عدن کے وحشی عربوں کو دیکھنے اور بات چیت کرنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس قوم میں ترقی کرنے اور دُنیا کی کشمکش میں تعجب خیز فروغ پانے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ صرف ایک سمیٹنے والی طاقت درکار ہے۔

افسوس ہندوستانی اپنی عزت اپنے ہاتھ سے کھوتے ہیں۔

آج ایک نہایت ناگوار واقعہ پیش آیا۔ فرسٹ کلاس کے ایک انجان اور ان پڑھ دیسی ایک کوچ پر اس طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھے کہ ایک انگریز کی وہ ٹوپی جو شام کو اوڑھی جاتی ہے، اُن کے نیچے دب گئی۔ انگریز اپنے کام سے واپس آیا تو ٹوپی تلاش کرنے لگا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ اس بھاری بھرکم اسٹیچو کے نیچے ہوگی۔

© https://www.khwajahasannizami.info

اِدھر اُدھر دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ جوں ہی یہ وجود فیل تن اٹھا تو دیکھا کہ ٹوپی ملی دلی پڑی ہے۔ انگریز غصہ سے بیتاب ہوگیا۔ اور اس قدر گالیاں دیں کہ توبہ۔ مناسب تھا کہ معذرت کی جاتی مگر وہ اس سے بیخبر تھے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُس انگریز سے معافی مانگ لی۔ ایسا ہی میرے کیبن میں ہوا۔ تھرڈ کلاس کے کچھ مسلمان مجھ سے ملنے آئے۔ اور رستم کے جی کے کوٹ پتلون پر کئی جگہ داغ لگ گئے۔ رستم جی باہر سے آئے اور کپڑے دیکھے تو دھبے نظر آئے۔ اُس وقت یہ لوگ موجود تھے۔ پارسی بچارا پھر ویسے ہی خاموش ہوگیا، تاہم مجھ کو بڑی شرمندگی ہوئی اور اُس سے معافی مانگنی پڑی۔

انہی حرکتوں سے یورپین ہم لوگوں سے نفرت کرتے ہیں اور جانور سمجھتے ہیں۔

۸۔ جون ۱۹۱۱ء

پنجشنبہ۔ امید کے خلاف بحر احمر بھی موجوں میں ہے۔ خبر نہیں اس کا نام سُرخ کیوں ہے۔ رنگ تو وہی دیکھنے میں سیاہ ہے (معلوم ہوا اس کی تہ کی مٹی سرخ ہے)

آج سورت کے ہندو جج صاحب سے ہندوستانی عورتوں کے مسئلہ پر خوب گفتگو ہوئی۔ جج صاحب کے ہمراہ اُن کی اہلیہ بھی ہیں جو بڑی تعلیم یافتہ اور انگریزی آداب سے ماہر ہیں۔ یہ دونوں بیچارے بڑے نیک دل ہیں۔ جج صاحب اکثر میرے پاس آکر دریافت کرجاتے ہیں کہ کچھ تکلیف تو نہیں۔ ان کی بیوی کو تھرڈ کلاس کی اُن مسلمان عورتوں سے جو مدینہ شریف جارہی ہیں، بڑی ہمدردی ہے۔ روزانہ میری معرفت اُن کی خیریت منگواتی ہیں۔

پردیس میں ہندو مسلمان کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے۔ کاش اپنے دیس میں بھی آپس میں یہی سلوک ہوتا۔

مرچیں دستیاب ہوگئی ہیں۔ انگریزی کھانے کو دشمن کرکے چھڑکتا ہوں اور مزے سے کھاتا ہوں۔ آج بصرے کے انگریزی کانسل جنرل سے خوب باتیں ہوئیں۔ فارسی میں طاق ہیں۔

اب تو یہ شغل ہے۔ کھانا کھایا اور اوپر چلا گیا۔ فرانسیسی دوست سے تاریخ اسلام اور درویشی کے متعلق باتیں شروع ہوگئیں۔ اور لوگ بھی جن کو فارسی آتی ہے آن بیٹھتے ہیں۔ ان کو وقت کاٹنے کا بہانہ ملتا ہے۔ میں تبلیغ کا فرض پورا کرتا ہوں۔ اسلام کے متعلق ان لوگوں میں سیکڑوں غلط فہمیاں ہیں۔ ان سے ملنے اور ان کو بتانے سمجھانے کی بڑی ضرورت ہے۔

۹۔ جون ۱۹۱۱ء

جمعہ۔ محمد رفیعی بے ترک کے حالات افسوس ہے اب تک نہیں لکھے۔ یہ اول بمبئی میں تُرکی سفیر کے ہاں ملے تھے۔ اب ہم سفر ہیں۔ گاہے گاہے ملاقات ہوتی ہے۔ آدمی روشن خیال اور کام کے ہیں۔ سفر کے لیے آج انھوں نے بہت مفید یاد داشتیں لکھوائیں۔ دریا میں بہت جوش ہے۔ پانی اُمنڈ اُمنڈ کر اور اُڑ اُڑ کر اوپر چلا آتا ہے اور کپڑے تر کر جاتا ہے۔

اب صرف دو روز سوئیز پہنچنے میں رہ گئے ہیں۔ یہ خاک نژاد آدمی پانی سے کتنی جلدی سیر ہوجاتا ہے۔ بار بار زمین پر چلنے کی حسرت ہوتی ہے۔

صبح کے وقت چھت پر بڑی بہار ہوتی ہے۔ میں اکثر نماز پڑھ کر قرآن شریف کی تلاوت وہیں کرتا ہوں۔ اس سرے سے اُس سرے تک برابر تختوں پر بستر بچھائے انگریز سویا کرتے ہیں۔ سب ایک رنگ کے، لیکن ان کے سونے کے کپڑے بڑے تماشے کے ہوتے ہیں۔ پنڈلیوں تک ایک پاجامہ اور چھوٹا سا کرتہ۔ بعض فقط ایک لمبا کُرتہ پہن لیتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کے یتیم پڑے ہیں۔ اور پھر اُن کا آنکھیں ملتے

© https://www.khwajahasanmirzaali.life

ہوئے اُٹھنا اور ننگے پاؤں نیفہ سنبھالتے ہوئے نیچے جانا۔ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اجمیر شریف کے دیگ لوٹنے والے، مگر سفید رنگ۔ ایک گھنٹہ کے بعد یہی لوگ مہذب شائستہ بن کر آجاتے ہیں۔ یہاں میرے اہلِ وطن کو عبرت سے غور کرنا چاہیے کہ اُن کا کوئی قرینہ درست نہیں۔ نہ کھانے کا وقت، نہ سونے کا وقت، نہ خوابگاہ کا کوئی ضابطہ، نہ بیداری کا کوئی قاعدہ۔ یہ لوگ ہر کام میں ایک دستور کے پابند ہیں۔ اور ہر یورپین خواہ انگریز ہو یا فرنچ، اٹالی ہو یا جرمن، سب یک در گیر محکم گیر کے مصداق ہیں۔ بلجیم کے ایک پادری صاحب جو کلکتہ میں لارڈ بشپ ہیں، اس جہاز میں ہیں۔ ہر رنگ میں ہیں۔ سارا دن شطرنج کھیلتے رہتے ہیں، اور مزا یہ کہ شرطیں باندھ باندھ کر کھیلتے کھلاتے ہیں۔ ہمارا کوئی مولوی ایسا کرتا تو کارِ طفلاں تمام خواہد شد، کا فتویٰ لگ جاتا، مگر یہ لوگ تو مذہب سے پہلے ہی آزاد ہیں۔ جو کچھ ہے پولیٹیکل تماشا ہے۔ القصہ ان لوگوں کا وقت جہاز میں عجب چہل پہل اور ہنسی خوشی میں گزرتا ہے۔

دریا کی موجوں نے ہل چل ڈال رکھی ہے۔ ہنڈولے کا مزا آتا ہے کبھی جہاز آسمان پر، کبھی زمین میں۔

۱۰۔ جون ۱۹۱۱ء

شنبہ۔ آج تھرڈ کلاس کے بھائی مسلمانوں میں نشست رہی۔ ان کلمہ گو صورتوں کی صحبت میں کیا بہار ہے کہ واہ سبحان اللہ! ایک پارسی بھی اس میں ہیں۔ ولایت میں بیرسٹری پڑھتے ہیں۔ ہر سال بمبئی چلے آتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ ایک سو تیس روپیہ کا خرچ ہے۔ چار روپیہ کا ایک پلنگ بمبئی سے لے لیا ہے۔ وہی میز، وہی کرسی، وہی خوابگاہ۔ سچ ہے غربت میں یہی چاہیے۔ غریب مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ بھی اسی درجہ میں سفر کیا کریں۔ اور گھر سے نکل کے خدا کا ملک دیکھیں۔ کچھ تکلیف نہیں۔ خدا سب آسان کر دیتا ہے۔ توکل شرط ہے۔

اہل یورپ ہر سال جماعتیں بنا کر ہندوستان کی سیر کو آتے ہیں، تو کیا ہم مسلمان گروہ قائم کر کے دنیا کی سیر کو نہ جائیں۔ وہ امیر ہیں۔ بڑے درجوں میں سفر کرتے ہیں۔ ہم غریب ہیں۔ چھوٹے درجوں میں سفر کریں۔ مجمع کے سبب خرچ میں بڑی کفایت ہوگی۔ سب سے پہلے اسلامی ممالک کی سیاحت کے لیے قدم بڑھانا چاہیے۔ میرا جی تو چاہتا ہے کہ اگلے سال ایک پورا جمگھٹا اکٹھا کر کے تمام عرب، عراق و افریقہ کی سیر کروں، جس کو یہ تجویز پسند ہو تیار ہو جائے اور عرب شام وروم افریقہ کے سفر میں بشرطیکہ تھرڈ کلاس ہو، پانسو روپیہ فی کس کافی ہیں۔ ہم کو وہاں جانا چاہیے جہاں آرام طلب سیاح نہیں جاتے۔ گاؤں گاؤں قصبے قصبے پھریں اور اپنے گزشتہ نام ونشان کی شان افسردہ دیکھیں۔

۱۱۔ جون ۱۹۱۱ء

یکشنبہ۔ آج صبح بصرہ کے انگریز کانسل جنرل سے کوئی ایک گھنٹہ مسلمانانِ عالم، علی الخصوص مسلمانانِ ترک کی نسبت گفتگو ہوئی۔ فارسی خوب بولتے ہیں۔ ان کو مسلمانوں کی موجودہ پستی کا افسوس ہے۔ سلطان عبدالحمید کا ذکر آیا۔ کہنے لگے "اگرچہ وہ خوب آدمی نہ تھا، لیکن وہ ایک تھا۔ اور اب پارلیمنٹ کے قائم ہونے سے ہر ترک عبدالحمید بن گیا ہے۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔" میں نے کہا تمھارے خیال میں پارلیمنٹ سے ترکوں میں کچھ ترقی ہوئی۔ جواب دیا۔ "میری دانست میں وہ ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے۔ وہی قہوہ نوشی اور سگار سوختنی کا مشغلہ ہے، کہتے بہت ہیں، کرتے خاک نہیں۔ ان کے منصوبے تو یہ ہیں کہ گلی گلی ریل، ٹراموے، ہوائی جہاز جاری کریں۔ مگر اس کا علاج نہیں سوچتے کہ یہ چیزیں جن سے مہیا ہوتی ہیں وہ بھی ان کے

پاس ہیں یا نہیں۔ ترک ایک جنگی قوم ہے اور جنگجوئی ان کے تمام افراد میں سرایت کر گئی ہے۔ یہ اچھی چیز ہے مگر قوم جس سے نشو ونما پاتی ہے وہ تجارت و حرفت ہے۔ اور جس سے اس کی جڑ جمتی ہے وہ جنگ ہے۔ ترکوں کی جڑ درست ہے مگر نشو ونما مطلق نہیں۔ ان میں ایک شخص بھی بنک اور تجارتی کاروبار کی قابلیت نہیں رکھتا جو آج کل اس کے لیے ضروری ہے۔ میں ہندوستان کے مسلمانوں میں ترقی کی جو حرکت پاتا ہوں، اُس سے مجھے امید ہے کہ وہ ترکوں سے پہلے منزل پر پہنچ جائیں گے، کیونکہ کامیابی ہمیشہ اس خیال سے ہوتی ہے کہ مجھے کچھ نہیں آتا، اس لیے مجھ کو سیکھنا چاہیے، مگر ترک، حکومت کے نشہ میں اپنے تئیں ہر چیز سے باخبر تصور کرتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔" میرا خیال ہے کہ کمانسل جنرل کی باتیں زیادہ تر اسی غلط فہمی پر مبنی تھیں جو یورپ میں ترکوں کی نسبت پھیلی ہوئی ہے۔

روزنامچہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ

ترجمہ ملا واحدی دہلوی

میلاد نامہ اور رسول بیتی

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

اعمال حزب البحر

(حصہ اول و دوم جلد یکجا)

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

شمس العلماء مصور فطرت

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

کا

تاریخی روزنامچہ

۱۹۳۱ء

درگاہ سلطان المشائخ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ

نئی دہلی میں

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد

عالموں، صوفیوں اور سجادگان کے قائم کردہ

حلقۂ نظام المشائخ

کی طرف سے شائع ہونے والی یادگار

دوسری بار

صفر ۱۴۳۳ھ — جنوری ۲۰۱۲ء

قیمت

-/250 روپے

ملنے کا پتہ

خواجہ حسن ثانی نظامی

بستی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء،

نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

© https://www.khwajahasannizami.life

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی خاکہ نگاری

جناب مجتبیٰ حسین

خواجہ حسن ثانی نظامی جو اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنا ثانی پیدا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، ان لوگوں میں سے ہیں، جن کے کسی حکم کو ٹالنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کی آئے دن بدلنے والی حکومتوں کے کسی حکم کو ماننا۔

پچھلے دنوں جب خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے عرس مبارک کے موقع پر منعقد ہونے والے سمینار میں خواجہ صاحب کی خاکہ نگاری پر کچھ اظہارِ خیال کروں تو میں نے دبی زبان میں عرض کیا کہ ''اس سے پہلے بھی میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔''

بولے ''تھوڑا سا اظہارِ خیال اور کر دیجیے۔'' اُن کی زبان سے تھوڑا سا اظہارِ خیال اور کرنے کی بات کچھ اس طرح ادا ہوئی کہ اُسے سُن کر مجھے حیدرآباد کے ایک نواب صاحب کا لطیفہ یاد آ گیا۔ نواب صاحب کے کسی دوست نے ایک دن انھیں یہ اطلاع دی کہ علی الصبح گھڑسواری کی جائے تو آدمی کی صحت اچھی رہتی ہے۔ نواب صاحب نے فوراً ایک گھوڑا خرید لیا اور ایک سائیس کو ملازم رکھ لیا۔ سائیس کو تاکید کی کہ وہ دوسرے دن علی الصبح انھیں گھڑسواری کے لیے جگا دے، مگر نواب صاحب دیر سے جاگنے کے عادی تھے۔ دوسرے دن سائیس نے گھوڑے کو تیار کر کے جب نواب صاحب کو جگانے کی کوشش کی تو نواب صاحب نے ایک لمبی جماہی لیتے ہوئے اور بستر میں کروٹ بدلتے ہوئے کہا ''جاؤ ہم ابھی آتے ہیں۔ گھوڑے پر زین کس دو۔'' سائیس نے تاڑ لیا کہ گھوڑا تو سواری کے لیے تیار ہے، لیکن نواب صاحب گھڑسواری کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لہٰذا کچھ وقفہ دے کر وہ پھر نواب صاحب کی خوابگاہ میں گیا اور انھیں دوبارہ جگانے کی کوشش شروع کی۔ اب کی بار نواب صاحب نے پھر ایک لمبی جماہی لیتے ہوئے کہا ''میاں! کیوں تنگ کرتے ہو۔ تم سے کہہ تو دیا کہ گھوڑے پر زین کس دو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔'' سائیس بولا ''حضور! زین کس دی ہے'' نواب صاحب نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا ''جاؤ، تھوڑی سی زین اور کس دو۔''

سچ تو یہ ہے کہ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی خاکہ نگاری کے بارے میں میرے اس اظہارِ خیال کی نوعیت ''تھوڑی سی زین اور کسنے'' کے سوائے کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ تو خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کی محبت ہے کہ وہ مجھ ناچیز کو سنجیدہ محفلوں میں بھی اظہارِ خیال کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ میرے ساتھ مشکل یہ ہے کہ میں کبھی کوئی سنجیدہ بات بھی کرتا ہوں تو لوگ ہنسنے لگ جاتے ہیں، بلکہ سنجیدہ بات پر ہی زیادہ ہنستے ہیں۔ سچ پوچھیے تو مجھ جیسے کم علم اور بے بضاعت آدمی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خواجہ حسن نظامیؒ جیسے عظیم المرتبت صوفی، صاحبِ طرز ادیب اور انشا پرداز کی خاکہ نگاری کے بارے میں اپنا منہ کھولنے کی جسارت کر سکے۔

اُردو میں خاکہ نگاری کی روایت کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ خالصتاً بیسویں صدی کی دین ہے۔ اس سے پہلے سوانحی مضمون اور تذکرے تو بہت سے مل جاتے ہیں، لیکن انھیں خاکے نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ کسی کے سوانحی حالات کسی کا خاکہ نہیں بن جاتے۔ ایک پروفیسر صاحب نے خاکہ نگاری کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں بہت پتہ کی

بات کہی ہے۔

''خاکہ نگار کا رویہ، موضوع بننے والی شخصیت کی طرف سوانح نگار کے رویے سے اس معاملہ میں مختلف ہوتا ہے کہ اس کی توجہ تصویر کے چند نمایاں لفظوں پر مرکوز ہوتی ہے۔ وہ نہ تو اس شخصیت سے منسوب ہر واقعے کی تفصیل میں جاتا ہے، نہ شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کی نظر انتخابی ہوتی ہے۔ وہ جہاں تہاں سے چند واقعات، شخصیت کے چند پہلوؤں تک اپنے آپ کو محدود کر لیتا ہے اور انہی واقعات اور پہلوؤں کی مدد سے ایسی تصویر بناتا ہے، جو ادھوری نہ لگے۔ خاکہ نگار ایک جامع اور ہمہ گیر اور متحرک تصویر لفظوں میں اُتار دیتا ہے۔''

خاکہ وہی اچھا ہوتا ہے، جس میں آدمی چلتا پھرتا دکھائی دے اور اس کی قربت کی آنچ کی گرمی پڑھنے والے کو بھی محسوس ہو۔

خواجہ صاحبؒ جس دَور میں زندہ رہے وہ نہ صرف برصغیر کی تاریخ کا اہم ترین دَور تھا، بلکہ عالمی سطح پر بھی اہم سیاسی، سماجی، معاشی اور انقلابی تبدیلیوں کا دَور تھا۔ پہلی جنگ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم کے بہت بعد تک ان کے قلم کا جادو چلتا رہا۔ کیا کیا موضوعات اور کیسے کیسے موضوعات اُن کے قلم کو میسر آئے۔ اس دور نے کئی اہم ہستیوں کو جنم دیا اور خواجہ صاحبؒ کی ان ساری اہم شخصیتوں سے دوستانہ اور بے تکلفانہ مراسم رہے۔ خواجہ صاحبؒ نے جہاں محمد علی جناح، علامہ اقبال ہز ہائی نس آغا خاں کے قلمی چہرے لکھے ہیں۔ وہیں مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مدن موہن مالویہ کے خاکے بھی لکھے ہیں۔

ہز ہائی نس آغا خاں پر خواجہ صاحب کے لکھے ہوئے خاکہ کا اقتباس سنیے:

''سر آغا خاں، زمانہ سازی میں انگریز، دولت مندی میں امریکی، قوت ارادی میں جرمن، عیش پسندی میں فرانسیسی، مطلب براری میں اطالوی، شجاعت میں ترک، ایثار میں افغانی، بذلہ سنجی میں ایرانی، پروپیگنڈے میں روسی، فرقہ پرستی میں ہندوستانی اور غرض مندی میں عرب ہیں۔ وہ دیکھنے میں بدیشی یوروپین، برتنے میں سودیشی مسلمان، اپنی ہندو امت کے لیے وشنو کا اوتار، ایران، ترکستان، افریقہ، عرب اور ہندوستان کے اسماعیلیوں کے حاضر امام، ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے لیے مسولینی اور ہٹلر۔ بڈھی برطانیہ کے لیے عصائے پیری۔ یورپ کے ہوٹلوں کے لیے سنہرے مہمان، گھڑ دوڑ کے لیے کامیابی۔ اپنی یورپین بیگم کے لیے پریم مورتی۔ اپنے فرقہ اور برٹش گورنمنٹ کے لیے کچھ بھی ہوں، مسلمانوں کی پراگندہ قوم کو مرکز پر جمع کرنے کا ان کو مدت سے شوق ہے۔''

غور فرمایئے تو خواجہ صاحب نے ان چند سطروں میں نہ صرف یہ کہ آغا خاں کا بھرپور شخصی خاکہ کھینچا ہے، بلکہ دنیا کی کئی اقوام کا اجتماعی خاکہ بھی کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس میں انگریزوں کی زمانہ سازی، فرانسیسیوں کی عیش پسندی، جرمنوں کی قوت ارادی سے لے کر ہندوستانیوں کی فرقہ پرستی تک سب کی پول کھول کر رکھ دی ہے۔ ان چند سطروں میں انھوں نے دریا کو نہیں بلکہ سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے۔

خاکہ نگاری کے میدان میں خواجہ صاحب کی یہ دین ناقابل فراموش ہے کہ وہ اردو کے اُن چند اوّلین خاکہ نگاروں میں سے ہیں، جنھوں نے روش عام سے ہٹ کر خاکے لکھے ہیں۔ اُن سے پہلے خاکے بہت خشوع و خضوع کے ساتھ لکھے جاتے تھے، بلکہ خاکہ لکھنے سے پہلے وضو کرنے کو بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے آدمی کو آدمی کے روپ میں پیش کرنے کا بیڑہ اُٹھایا، اُسے خواہ مخواہ فرشتہ یا شیطان بنانے کی کوشش نہیں کی۔

© https://www.khwajahasanizami.life

اُس کی اچھائیوں کے ساتھ اُس کی برائیوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک خوبصورت پیرایۂ بیان کو اپنائیں اور وہ پیرایۂ بیان ان کا اپنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں جہاں گہرائی و گیرائی ہے، وہیں شوخی و شرارت، چلبلا پن اور ظرافت بھی ہے۔ ان کے خاکوں میں بے تکلفی کی ایک ایسی فضا ہے جو ان سے پہلے کسی خاکہ نگار کے ہاں نہیں پائی جاتی۔ اردو ادب پر خواجہ صاحب کا یہ احسان کیا کم ہے کہ وہ اس اسلوب کے موجد تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین پر انھوں نے جو خاکہ لکھا ہے اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''.....ڈاکٹر ذاکر حسین دو صدی پہلے پیدا ہو جاتے تو ہماری سلطنت غارت نہ ہوتی۔ وہ سلطنت قائم کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں، بلکہ ہندوستانیوں کو انسان بنانے کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ اگر عمر کا منتقل کرنا ممکن ہوتا تو میں اپنی زندگی کے پانچ مہینے ان کو دے سکتا تھا، زیادہ نہیں، کیونکہ میں فضول خرچی کو بُرا سمجھتا ہوں.....''

اُردو میں خواجہ صاحب کے Stamina اور بَل بوتے کا شاید ہی کوئی اور ادیب رہا ہو۔ جس ادیب نے مختلف النوع موضوعات پر پانچ سو سے زائد کتابیں تصنیف کی ہوں اس کے حوصلے اور تخلیقی صلاحیت کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پھر خواجہ صاحب کی شخصیت کی کئی جہتیں اور پرتیں ہیں، جہاں وہ صوفی اور زاہد پاکباز ہیں، وہیں وہ صحافی اور رندوں کے ہم مشروب نہ سہی ہم مشرب بھی ہیں۔ دیندار بھی ہیں اور دنیا دار بھی۔ مفسر قرآن بھی ہیں اور اردو کے چونچال اور چلبلے ادیب بھی ہیں۔ ایک طرف اللہ میاں کا قلمی چہرہ لکھ کر جنت میں اپنے لیے جگہ بنا رہے ہیں تو دوسری طرف شیطان کا قلمی چہرہ لکھ کر جہنم کی آگ کو اُس کے لیے گوارا بنا رہے ہیں کہ میاں جہاں بھی رہو خوش رہو۔ خواجہ صاحب کی اس ہشت پہلو شخصیت نے انھیں وہ ادراک اور شعور عطا کیا ہے، جس کے ذریعہ وہ کسی بھی کردار کے ظاہر و باطن دونوں کی صحیح خبر لے آتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے سینکڑوں قلمی چہرے اور خاکے لکھے، لیکن کسی بھی خاکہ کو لکھتے ہوئے صاحب خاکہ کے تعلق سے اپنے کسی بھی قسم کے ذاتی تعصب کا اظہار نہیں کیا۔ حد تو یہ کہ وہ شیطان کا قلمی چہرہ لکھتے ہوئے بھی اُس کے لیے ہمدردی کے جذبات اور ایک نرم گوشہ ضرور رکھتے ہیں۔ شیطان کے خاکے میں لکھتے ہیں کہ ساری فلم ایکٹریسیں اسی کی جھولی سے نکلتی ہیں، لیکن جب فلم ایکٹریس کجن کا خاکہ لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں:

''.....لمبا قد، کامنی بدن، گول چہرہ، آنکھیں نہ بڑی نہ چھوٹی، مگر پُر اثر ہیں۔ رنگ سانولا معلوم ہوتا ہے۔ اسٹیج پر گوری نظر آتی ہے۔ عمر جوانی کی راتوں اور مرادوں کے دنوں کی ہے۔ مسلمان حساب نہیں جانتے، ریاضی نہیں جانتے جو کجن کی عمر کا حساب بتا سکیں یا اس کے قد کی رعنائی ناپ سکیں.....اس کی ایکٹنگ میں شوخی و شرارت نہیں ہے، بلکہ ایک وقار اور مصنوعی متانت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی رفتار و گفتار میں ایک سلیقہ اور تمیز ہے۔ کہا جاتا ہے وہ پیشہ ور رقاصہ ہے اور اسٹیج پر کام سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ رقص اور اس کے لوازمات کو اتنا ہی جانتی ہے، جتنا پیشہ ور کو جاننا چاہیے۔ فلم کے مشاہدے سے اس کی سیرت کا جس قدر اندازہ کرنا ممکن ہے، یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو نوکری کے جبر سے نہیں، بلکہ دلی شوق سے کرنے والی نظر آتی ہے..... وہ اور اس جیسی سب ایکٹریسیں جب ڈرامہ نویسوں کے ان الفاظ کو تماشائیوں کے سامنے بولتی ہیں، جن میں بیسوا کی بُرائیاں ہوتی ہیں تو اُن کا دل ہنسا کرتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ ان الفاظ سے طوائف بازی کا ذوق کم نہیں ہوتا، بلکہ

جذبات میں نیکی آمیز گناہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی عورتیں فلم میں نہ ہوں تو کوئی فلم دیکھنے نہ آئے اور فلم کے ذریعہ جو فائدہ دماغوں اور ذہنوں کی تبدیلی کا اٹھایا جاتا ہے، وہ حاصل نہ ہو سکے.....''

اس طرح کے خاکوں سے خواجہ صاحب کی وسیع النظری، وسیع المشربی، وسیع القلبی اور رواداری کا اظہار ہوتا ہے۔ کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ خواجہ حسن نظامیؒ جیسے عالم دین اور صوفی کی تحریر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جب ادیب کے روپ میں سامنے آتے ہیں تو اپنے زہد و تقویٰ کو اپنی ادبیت پر غالب نہیں آنے دیتے۔

خواجہ صاحب کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اگر کسی خاکہ میں خود ان کا ذکر آ جائے تو اپنا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ صرف ظرافت کی بات نہیں ظرف کی بات بھی ہے۔ مولویوں کا مذاق اُڑانے میں وہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سر محمد یعقوب کے خاکے میں لکھتے ہیں:

''.....مسلمانوں کی طرح ان کا دستر خوان وسیع ہے۔ ہمیشہ کھلاتے ہیں اور کھلا کر خوش بھی ہوتے ہیں۔ ان کی خندہ پیشانی اور بذلہ سنجی اور طبیعت کی شگفتگی ملاقاتی کے لیے ایک عمدہ غذائے روح ہوتی ہے۔ اگر ان کی داڑھی بھی ہوتی تو شاید وہ بھی مولویوں کی طرح فقط دعوت کھایا کرتے۔ کھلانے سے احتیاط کیا کرتے اور مجرد بھی نہ رہتے، بلکہ چار نکاح کرتے.....''

خواجہ صاحب کا سب سے بڑا ہتھیار ان کی اچھوتی اور نرالی زبان ہے، جسے انھوں نے امراء کے ایوانوں اور علماء کے دیوان خانوں سے نہیں اُٹھایا، بلکہ سڑک سے اٹھایا ہے۔ جس طرح کی عام بول چال کی سیدھی سادی، دلوں کو چھونے والی، میٹھی اور رواں دواں زبان انھیں ملی تھی، ان کے ہم عصروں میں کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ بعض ناقدوں نے ان کے اسلوب نگارش کا تقابل ان کے ہم عصر مولانا ابوالکلام آزاد کے طرز نگارش سے کیا ہے۔ مولانا آزاد کے عالمانہ اسلوب کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن خواجہ حسن نظامی کی زبان کی عوامی مقبولیت بھی اپنی جگہ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ کسی منچلے نے مولانا آزاد کی زبان کے بارے میں کہا تھا کہ مولانا آزاد زندگی بھر اردو لکھنے کی کوشش میں عربی لکھتے رہے۔ خواجہ حسن نظامی نے کبھی اردو لکھنے کی کوشش میں فارسی یا عربی نہیں لکھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اردو لکھنے کی کوشش ہی نہیں کی، بلکہ اردو نے ہی اپنے آپ کو خواجہ حسن نظامیؒ سے لکھوایا۔ بے ساختگی، لطافت اور روانی ان کے اسلوب نگارش کی امتیازی خصوصیت ہے۔ وہ جب قلم برداشتہ کسی کا خاکہ لکھتے ہیں تو اپنی موثر زبان کے ذریعہ اس کردار کو نہ صرف چلاتے پھراتے ہیں، بلکہ قوت گویائی بھی عطا کر دیتے ہیں۔ جیسا کردار ہوتا ہے، ویسی ہی زبان اس کا خاکہ لکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے خاکوں کی مقبولیت کا راز ان کی اسی دلآویز زبان میں پوشیدہ ہے۔

برسوں پہلے نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری میں عوامی زبان اور موضوعات کے تخلیقی استعمال کی جو روایت چھوڑی تھی اُسے خواجہ صاحب نے اپنی نثر میں مستحکم کیا۔

خواجہ صاحب کی خاکہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ وہ صرف خاکہ نگار نہیں تھے، بلکہ خاکہ نگاری اُن کے کل ادبی سرمایہ کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ تاہم انھوں نے ہندوستان کے کئی بڑے مدبروں، دانشوروں، ادیبوں اور فنکاروں کے سینکڑوں قلمی چہرے لکھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خواجہ صاحب کے منتخب خاکوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے تاکہ ادب کے طالب علموں کو خاکہ نگاری کے میدان میں خواجہ صاحب کی دین کا اندازہ ہو سکے۔

○○○

© https://www.khwajahasannizami.life

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اور مذہبی مفاہمت

خواجہ حسن ثانی نظامی

ہم آپ ہی کیا، ایک دنیا کہتی ہے کہ عورت کو آزادی مغرب نے عطا کی ہے، مگر ہمارے سابق راشٹر پتی سروپلی رادھا کرشنن جی نے یہ طلسم توڑ دیا اور بڑی عارفانہ اور مزیدار بات کہی کہ مغرب نے تو صرف اتنا کیا ہے کہ عورت کو مرد بنا دیا اور ظاہر ہے مرد بنتے ہی اس کو بھی اسی قسم کی آزادی حاصل ہوگئی، جو قوّامون علی النساء یعنی مردوں کا حصہ تھی۔ بات تو جب تھی کہ عورت عورت رہتی اور پھر اس کو آزادی ملتی۔

مذہبی مفاہمت، قومی یکجہتی اور باہمی اتحاد کے لیے بھی ہمارا رویہ کچھ اسی قسم کا ہے کہ ہر چیز کو جگہ سے بے جگہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اپنی جانم میں سب مذہبوں، سب قوموں، سب فرقوں، سب تہذیبوں کا ایک گھولوا تیار کرنے کو یک جہتی اور ملاپ سمجھتے ہیں۔ ان کی ارواح نہ شرمائے، اکبر شاہ بھی جیتے جی یہی سمجھا کیے اور ان کی لکیر کو سمجھے بوجھے بغیر فقیر تو فقیر امیر تک اختیار کیے بیٹھے ہیں۔ رادھا کرشنن جی کے بقول بات تو جب تھی کہ ہندو ہندو رہتا، مسلمان مسلمان، جنوب جنوب ہوتا، شمال شمال۔ قالب کئی تھے تو ہوا کرتے، جان ایک رہتی، جیسی کہ وہ ہے اور یہ جان جانِ جہاں بن جاتی!

اس بات پر مجھے ایک لطیفہ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا یاد آتا ہے۔ میل ملاپ اور اتحاد کے کسی جلسے میں ایک مقرر نے کہیں یہ کہہ دیا کہ سب کو شیر و شکر بن کر رہنا چاہیے۔ خواجہ صاحبؒ کی باری آئی تو انھوں نے ایک سائنٹسٹ کی طرح اس قول کا تجزیہ کر ڈالا اور کہا کہ شیر و شکر میں شیر یعنی دودھ اکثریت میں ہوتا ہے اور شکر اقلیت میں ہوتی ہے۔ ان دونوں کے ملنے سے دودھ تو ضرور میٹھا ہو جاتا ہے، لیکن شکر بے چاری اپنا وجود کھو دیتی ہے، اس لیے مجھے امید نہیں ہے کہ اقلیت والے اس طرح کے میل ملاپ کے لیے تیار ہوں گے۔

خوف، دہشت اور اندیشے کی حالت میں آپ کسی سے بھی ٹھنڈے دل اور صحیح فیصلے کی توقع نہیں کر سکتے اور زور زبردستی اور جبر کا ملاپ قانونی، اخلاقی کسی اعتبار سے بھی درست نہیں ہو سکتا۔ شمس العلماء مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اس بھید کو جان گئے تھے کہ ہندوستان میں دوری اور بے اعتباری اور غلط فہمی سب کی بنیاد خوف اور اندیشے پر ہے اور یہ خوف اور اندیشہ بہت حد تک ناواقفیت کی پیداوار ہے۔ اصل میں نہ مسلمان کو اس کی خبر ہے کہ ہندو کیا ہے اور کیا چاہتا ہے اور نہ مسلمان ہندوؤں کے مذہب اور ان کے ارادوں سے حقیقتاً آگاہ ہے۔ بس دور دور سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور ڈرے سہمے جاتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے سب سے پہلے تو خود دیگر مذاہب سے واقفیت حاصل کرنا چاہی اور پھر اسلام سے برادران وطن کو واقف کرانے کی بھرپور کوشش کی۔ ہندو مذہب کو جاننے کے لیے انھوں نے ایک سادھو اور جوگی کے روپ میں جگہ جگہ دھونی رمائی، ہندو ولایات اور گیان کے مرکزوں کا دورہ کیا۔ مہاتماؤں کی آنکھیں دیکھیں، دو دوانوں کی صحبت اٹھائی، تیرتھوں کی یاترا کرتے وقت انھوں نے یہ پروا بھی نہ کی کہ اس سے خود ان کے اپنے بھائی بندوں میں غلط فہمیاں پھیل سکتی ہیں، چنانچہ سب جانتے ہیں کہ یہ غلط فہمیاں پھیلیں۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو مولویوں کے دستخطوں سے ان پر کفر کے فتوے لگے۔ برادری نے برسوں حقہ پانی بند رکھا، لیکن ایک دن

دودھ اور پانی الگ ہو کر رہے اور مسلمانوں نے آخر کار دیکھ لیا کہ ان کا بھائی سچا اور پکا مسلمان ہے اور لاکھوں میں ایک ہے، دیگر مذاہب کا عرفان حاصل کرنے کے بعد خواجہ صاحبؒ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اردو میں کرشن جی، رام چندر جی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بابا گورو نانک صاحب کی سوانح عمریاں لکھیں اور ان کی تعلیمات سے مسلمانوں کو واقف کرایا۔ خواجہ صاحبؒ نے ان بزرگوں کی پاک زندگیوں کا مطالعہ ڈوب کر کیا تھا اور یہ ناممکن بات تھی کہ کوئی شخص اس طرح کے مطالعے کے بعد متاثر ہوئے بغیر رہ جاتا۔ چنانچہ جنھوں نے خواجہ صاحب کی لکھی ہوئی ان سوانح عمریوں کو پڑھا ہے انھیں خواجہ صاحب کرشن بھگت، عیسیٰ بھگت اور نانک بھگت کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے اپنے عقیدے کو ایک لمحے کے لیے بھی کبھی ترک نہیں کیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی سوانح عمری کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں اور عیسائیوں میں تیرہ سو برس سے سیاسی لڑائیاں ہوتی آئیں ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اس واسطے ہر قوم کے آدمی ایک دوسرے کے پیشوا اور مذہب کے ہادی سے اور اس کی اصلی حقیقت سے بے خبر اور نا آشنا ہیں اور سیاسی تعصبات کے سبب اصلی بات کو سننا اور جاننا بھی نہیں چاہتے۔ ان کو اس کتاب کے ذریعے معلوم ہو جائے گا کہ سیاسی یا کسی اور خارجی وجہ سے سچی اور اچھی باتوں کو ترک کر دینا اور معلوم نہ کرنا بہت بے عقلی کی بات ہے..... کوئی قوم دوسری قوم کے مذہبی پیشوا کے صحیح حالات پڑھنے کے سبب اپنے عقائد سے منحرف نہیں ہو سکتی۔ اگر عیسائی لوگ حضرت محمد رسول اللہؐ کے اصلی حالات پڑھیں تو مسلمان نہیں ہو جائیں گے اور مسلمان اگر حضرت عیسیٰؑ کے حالات کا مطالعہ کریں تو وہ عیسائی نہ بن جائیں گے..... میں نے ہندوؤں کے مشہور اوتار سری کرشن جی کے حالات پر کئی سال ہوئے ایک کتاب لکھی تھی، جو کئی بار چھپ چکی ہے اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہو گئے ہیں، مگر آج تک نہیں سنا کہ کوئی مسلمان اس کو پڑھ کر ہندو ہو گیا ہو یا کوئی ہندو اس کے پڑھنے سے مسلمان ہو گیا ہو۔''

میں نے ابتدا میں جان کے جان جہاں بننے کا ذکر کیا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہمیں خود خواجہ صاحبؒ کے ہاں نظر آئی ہے اور اس کو دراصل یک جہتی اور ملاپ سمجھنا بھی چاہیے۔ خواجہ صاحب عید میلاد پر ایک مضمون لکھ رہے ہیں۔ ماہ نامہ نظام المشائخ کے رسول نمبر کے لیے، اسلامی حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش اور اس دنیا میں تشریف آوری کا ذکر ہو رہا ہے۔ ایک خالص مذہبی اور یوں کہنا چاہیے کہ اپنے گھر کی بات ہے، مگر مضمون کی اٹھان اور تیور دیکھیے:

''غریبوں کا سلام لیجیے، گنہگاروں کا مجرا قبول فرمایئے، بے کس ولاچار امت کے خیر مقدم پر نظر توجہ ڈالیے۔ آج اوراق نظام المشائخ کے پلیٹ فارم پر ہم سب آپ کا استقبال اور خیر مقدم کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ یہ ایک طرف آپ کی غریب امت کھڑی ہے، دوسری جانب عیسائی، ہندو، آریہ ہیں، جو تہنیت کے گلدستے پیش کرنے چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ لوگ اپنے حاکم کے سامنے استقبال کے وقت اپنی ضروریات ظاہر کیا کرتے ہیں، گذشتہ کارناموں کو سناتے ہیں۔ موجودہ حالت کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور پھر اظہار رائے کے طلب گار ہوتے ہیں۔ دادرسی اور مراعات وانعامات کا یہی موقع سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ہندوستان میں اپنے دین دنیا کے بادشاہ کا استقبال کرتے وقت رسم زمانہ کے موافق عرض حال ضروری سمجھتے ہیں..... جہاں پناہ یہ سن کر کمال درجہ مسرور ہوں گے کہ یہ ملک علوم الٰہیہ کے قبول کرنے اور ان میں جی لگا کر

مصروف ہونے کی خاص صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں بھی اگلے زمانے میں توحید کا چرچا رہ چکا ہے۔ اس خطے میں بھی خدا تعالیٰ نے اپنے مقبول بندوں شری رام چندر جی، وشری کرشن جی و مہاتما بدھ کے ذریعے کلام حق بھیجا تھا..... خل سبحانی کی سمع اقدس میں یہ واقعہ پیش ہونا ضروری ہے کہ اس ملک کی آسمانی کتاب میں وحدت الٰہی کا یہ کلمہ ارشاد ہوا ہے کہ ''ایکو برہم دوتیوناستی'' جس کا عربی مفہوم لا الٰہ الا اللہ ہے..... جب ہم غلامان رسالتؐ اس دیار میں وارد ہوئے اور حضور عالیؐ کا پیام یہاں کے باشندوں کو سنایا تو وہ جوق جوق آئے اور آپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا.....''

حضرت خواجہ صاحبؒ کے اسی رنگ نے ایک طرف مسلمانوں کو خاص کر ان کے مسلمان مریدوں اور عقیدت مندوں کو بے حد متاثر کیا، ان میں دیگر مذاہب اور ان کے بڑے لوگوں کی فہمید اور عرفان پیدا ہوا اور دوسری طرف بہت سے غیر مسلموں کے نزدیک وہ غیر نہیں رہے، ان کی بات یگانگت کے جذبے اور محبت سے سنی گئی۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کے مریدوں اور عقیدت مندوں میں ہندو، سکھ، عیسائی ہی شامل نہیں تھے، یہودی تک ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ بستی حضرت نظام الدین اولیاء کے بوڑھے باشندے بمبئی کے ڈیوڈ شیلم نظامی کو بھولے نہ ہوں گے، جن کا تعلق بمبئی کے مشہور امیر کبیر یہودی سسون گھرانے سے تھا اور جنھوں نے حضرت خواجہ صاحبؒ کے جدّ اعلیٰ حضرت خواجہ سید محمد امام نظامی کے مزار اور احاطہ درگاہ کی تعمیر کے وقت مزدوروں کے ساتھ اینٹ گارا ڈھویا تھا۔ ڈیوڈ شیلم کی عقیدت ہو یا مہاراجہ سر کشن پرشاد سابق صدر اعظم ریاست حیدر آباد کی محبت اور ارادت، ان سب کے پیچھے یہی حقیقت کارفرما تھی کہ حضرت خواجہ صاحبؒ میں انھوں نے ایک ایسا انسان پالیا تھا، جو مسلمان ہونے کے باوجود، علیحدہ رسم و رواج کا عادی ہونے کے باوجود، انھیں اپنا ہی محسوس ہوتا تھا۔ بنیادی قدریں انھیں سب مشترک ہی نظر آنے لگی تھیں، ان لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ جس البیلے انداز اور والہانہ کیفیت سے خواجہ صاحبؒ نے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری لکھی ہے، وہی کیفیت حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، گورو نانک اور کرشن جی کی بپتی لکھتے وقت بھی موجود ہے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ نے کرشن جی کی پیدائش کو سچائی کے سویرے سے تشبیہہ دی اور لکھا:

''لو وقت آ گیا۔ رات کی تاریکی کے نور کا تیر لگا۔ اندھیرے کا سینہ چھد گیا، بھادوں کی کالی رات، متھرا کی ظلم کار سیاہی سے گلے مل رہی ہے، زخمی ہے، دم دے رہی ہے۔ خدا نے کالی گھٹا کو بھیجا ہے۔ بادلوں کی گرج کو ساتھ کیا ہے۔ بجلی قہر کی زبانیں نکال نکال ابر کا لشکر سمیٹے لیے چلی آتی ہے —— ذرا ٹھہرنا، تیز ہوا کا سناٹا، کڑک، چمک اور بارش کا شور سننے نہیں دیتا۔ متھرا میں غیبی ارواح کیا نغمہ گا رہی ہیں، کس کی آمد کا ترانہ سنا رہی ہیں۔''

اس کے بعد خواجہ صاحبؒ کرشن جی کے پروان چڑھنے کو دن کی شروعات سے تعبیر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''دودھ کے تالاب میں کرشن کا سفید کنول کھلا۔ بارہ گھنٹے سورج نے بارہ گھنٹے چاند نے سایہ ڈال ڈال کر اس کنول کو پالنا شروع کیا۔ جنگل کی صاف ہوا نے پنکھے جھلے، جمنا کے پاک پانی نے ہاتھ منہ دھلائے اور اس طرح اس روشن دن کی پرورش ہونے لگی، جس کو قدرت نے ہندوستان کی تاریکیاں اور ظلم کی شب دیجور، دور اور فنا کرنے کے لیے بھیجا تھا —— وہ وقت بھی آیا کرشن جی نے طفلی کا پردہ اٹھایا۔ جسودھا کی گود سے نیچے اترے، بیٹھنا سیکھا، کھڑا ہونا سیکھا، چلنے پھرنے لگے۔ گوالیے سمجھے لڑکا

© https://www.khwajahasannizami.life

ہوش میں آیا، ہاتف نے آواز دی۔ یہ بے ہوش کب تھا، عالم اسباب کی شکل بشر میں آیا تھا۔ اس واسطے کچھ دن چپ چاپ پڑا رہا۔ ورنہ یہ ازلی ہوش وحواس کا خزانہ لے کر زمین پر اترا تھا، اس کو عمر کے ان تغیرات کی محتاجی نہ تھی، جس کو تم بچپن، جوانی اور بڑھاپا کہتے ہو۔"

گورونانک صاحب کا تذکرہ آتا ہے تو خواجہ صاحبؒ کا قلم یوں موتی بکھیرتا ہے:

"سچے خدا کا سچا ولی، توحید کا سمندر، حقانیت کا طوطی ہزار داستان، پانچ دریاؤں کے ملک میں حواس خمسہ کو شیریں گفتار سے دست وحدت دینے والا، ست گورونانک صاحب —— سونے چاندی اور ہیرے موتی کی دھوم دھام میں، جس نے غریب لوہے کو عزت کا تاج پہنایا۔ ہر چیلے کے ہاتھ میں آہنی کڑا ڈال کر غریب پرست بنایا۔ نانک فطرت الٰہی کی آنکھ کا تارہ تھے، جس میں نور محمدیؐ جلوہ فگن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے رسول عرب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح غیر خدا کی پرستش سے انکار کیا اور مراسم جہالت کو توڑ ڈالا اور کائنات کے ہر ذرّے کو نظر توحید سے دیکھا —— ایسی نظریں ادب کے قابل ہیں، پیار کے قابل ہیں۔ انسان اپنی سب قابلیتیں ان پر نثار کردے اور فدا ہوجائے۔"

حضرت خواجہ صاحبؒ نے قرآن مجید کا ہندوی ترجمہ آج سے تقریباً ستر اسّی سال قبل شائع کردیا تھا۔ اس ترجمے کی تیاری کے وقت تبلیغ قرآن کے علاوہ یہ مقصد بھی ان کے پیش نظر تھا کہ اس طرح غیر مسلموں کی رسائی قرآن مجید تک براہ راست ہوجائے گی اور جو غلط فہمیاں مسلمانوں اور تعلیم اسلام سے متعلق پھیلی ہوئی ہیں وہ دور ہوجائیں گی، مہاتما گاندھی کے پاس اس ترجمے کی کاپی پہنچی تو انھوں نے خواجہ صاحبؒ کو بطور خاص داد دی اور کہا کہ یہ کام سینکڑوں برس پہلے ہی ہوجانا چاہیے تھا، اگر ایسا ہوتا تو غلط فہمیوں کی نوبت ہی نہ آتی۔

خواجہ صاحب کا روزنامچہ پڑھنے والے اندازہ کرسکتے ہیں کہ انھیں ہر وقت یہ لگن لگی رہتی تھی کہ کسی طرح کثرت میں وحدت ہاتھ آجائے۔ ۱۹۳۴ء کے محرّم میں وہ اتفاق سے حیدرآباد میں تھے۔ چار مینار کی عمارت سے انھوں نے محرم کا جلوس دیکھا اور پھر اپنے روزنامچے میں اس کا جو حال لکھا وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہو:

"حیدرآباد شہر کے چوک میں ایک شاندار عمارت چار مینار کے نام سے مشہور ہے، جس کی تصویر موجودہ حیدرآبادی سکّوں پر بھی ہے۔ یہ عمارت بھی قطب شاہی ہے اور ان بادشاہوں نے چونے پتھر کا یہ ایک عظیم الشان تعزیہ بنایا تھا، جو صدیوں سے آج تک قائم ہے، جس کی چھت کے اوپر ایک رخ مسجد ہے اور دوسرے رخ مندر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک کے ہندو مسلمان اگر متحد ہوسکتے ہیں تو مراسم محرم اور تعزیے پر متحد ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ آج اس ملک میں ہر جگہ یہ چیز نظر آتی ہے کہ مراسم محرم میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو حصہ لیتے ہیں....."

اس کے بعد خواجہ صاحبؒ جلوس کے ہجوم کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"اس ہجوم میں فیصدی ۸۰ ہندو تھے اور فیصدی ۲۰ مسلمان تھے اور یہ اندازہ میں نے ہجوم کی دھوتیوں اور پائجاموں سے کیا۔ کیونکہ ہندو سب دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ آج میں نے جانا کہ یہ مراسم محرم ہندو مسلم اتحاد کے لیے کس قدر ضروری اور مفید ہیں۔"

آخر میں حضرت خواجہ صاحبؒ کی تحریروں سے بس ایک اقتباس اور پیش کرتا ہوں، جس سے معلوم ہوگا کہ یک جہتی کا

ہماری قومی زندگی میں کیا مقام ہے۔ خواجہ صاحبؒ نے لکھا تھا:

''جنگ یوروپ کے بعد ہم سب کو اپنی برطانی سرکار سے سوراج، سلف گورنمنٹ، ہوم رول یا حکومت خود اختیاری ملنے کی توقع لگی ہوئی ہے، مگر وہ توقع کیونکر پوری ہوسکتی ہے، جبکہ ہماری زبانوں میں اختلاف ہے۔ ہمارے مذاہب میں اختلاف ہے۔ ہماری معاشرت یعنی رہنے سہنے میں اختلاف ہے اور ہم میں سے ہر ایک فرقہ دوسرے ہم وطن گروہ سے ٹوٹا ہوا اور بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک اصولی اتحاد کے بغیر ہندوستان کو حکومت خود اختیاری کے قابل قیامت تک نہ سمجھا جائے اور اس کا ذریعہ یہی ہے کہ ہندو اپنے عقائد گھروں اور دلوں تک محدود رکھیں اور مسلمانوں سے ان کو ٹکرانے کی کوشش نہ کریں اور مسلمان اپنے عقائد و اعمال میں خانگی طور پر سرگرم رہ کر دوسرے فرقوں اور مذاہب کی مداخلت سے احتیاط رکھیں، تاکہ باہر کی دنیا میں طرز عمل اور برتاؤ ہم سب کا بالکل متحد نظر آئے اور یہ جب ہی ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے بزرگوں کی عزت کرنی سیکھیں اور ان سے واقفیت حاصل کرکے غیر ہندی اقوام کے سامنے ان کا ذکر فخر کے ساتھ کیا کریں کہ ہمارے کرشن ایسے تھے، ہمارے رام ایسے تھے۔ ہمارے اکبر ایسے تھے، ہمارے شاہ جہاں ایسے تھے۔'' ○○○

تذکرۂ نظامی

خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی

مختصر سوانح حیات، تعلیمات، اعمال و وظائف

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ

نظامی بنسری

نوشتہ مصور فطرت خواجہ حسن نظامیؒ

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے ایک ہندو مرید راجکمار ہردیو نامی، جو بعد میں مسلمان ہوگئے۔ احمد ایاز ان کا نام رکھا گیا۔ خواجہ جہاں خطاب ملا۔ سلطان محمد تغلق کے داماد اور ہندوستان کے وزیر اعظم بنائے گئے۔ انھوں نے اپنے پیر کے ہاں حاضری کی ڈائری چہل روزہ کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور دیگر تاریخی کتابوں اور ملفوظات سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے سوانح حیات اور تعلیمات کو جمع کرکے اپنی معرکۃ الآراء کتاب نظامی بنسری میں شائع کیا۔ جس نے یہ کتاب ایک دفع پڑھ لی، وہ اس کو بار بار ورد اور وظیفے کی طرح پڑھتا ہے۔ بیمار اس کتاب کو پڑھنے اور سننے سے تندرست ہوجاتے ہیں اور ہر شخص مطالعے کے وقت ایسا محسوس کرتا ہے، گویا وہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی مجلس میں حاضر ہے، اور حضرت کی خصوصی توجہات اس کو حاصل ہیں۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے ہیں۔ نیا ایڈیشن تیار ہے۔ ضخامت پانچ سو صفحات سے زیادہ ہے۔

نیا ایڈیشن اردو ——— قیمت: ۴۰۰ روپے

نیا ایڈیشن ہندی ——— قیمت: ۵۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

خواجہ حسن ثانی نظامی، خواجہ ہال۔ بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ، نئی دہلی۔ 110013

© https://www.khwajahasannizami.life

مصورِ فطرت شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

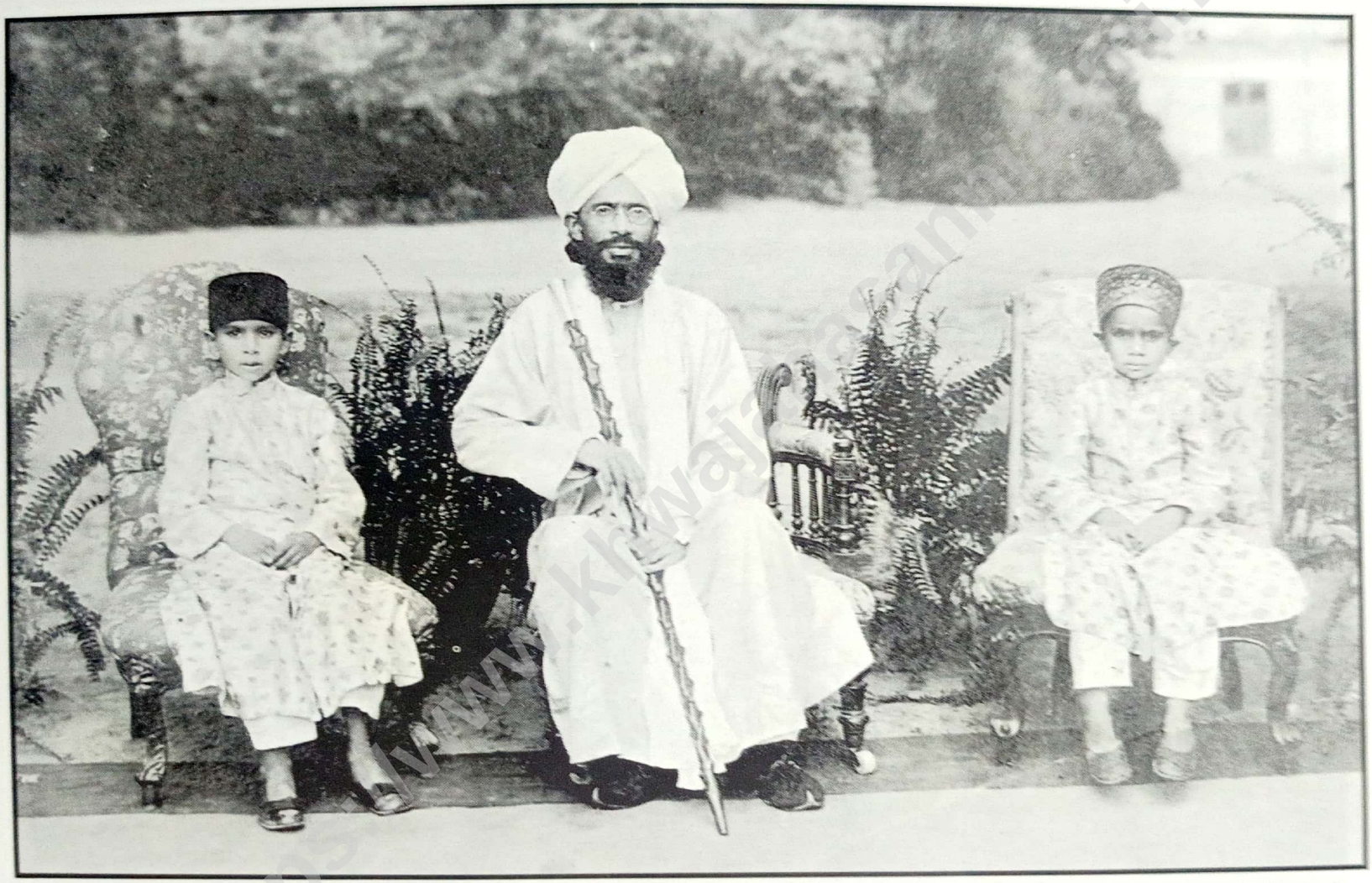
کی تمام بے مثال و نادر تصنیفات نیز خواجہ حسن ثانی نظامی کی کتابیں

ترتیلی ترجمہ قرآن مجید (اردو)	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/400
ترتیلی ترجمہ قرآن مجید (ہندی)	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/400
تاریخی روزنامچہ ۱۹۳۱ء	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/250
مراۃ الاسرار (اردو)	حضرت شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ	قیمت: -/800
سیر الاولیاء (فارسی)	حضرت اعجاز الحق قدوسیؒ	قیمت: -/800
سیر الاولیاء (اردو)	حضرت اعجاز الحق قدوسیؒ	قیمت: -/600
سفرنامہ مصر و شام و حجاز	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/350
1857 کی بارہ کتابیں ایک جلد میں	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/800
فوائد الفواد (اردو)	خواجہ حسن ثانی نظامی	قیمت: -/800
فوائد الفواد (ہندی)	خواجہ حسن ثانی نظامی	قیمت: -/800
نظامی بنسری	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/400
تصوف، رسم اور حقیقت	خواجہ حسن ثانی نظامی	قیمت: -/200
سی پارۂ دل (اردو)	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/150
سی پارۂ دل (ہندی)	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت:
میلاد نامہ	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/100
راحت القلوب	حضرت ملا واحدیؒ	قیمت: -/75
اعمال حزب البحر	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/200
مرشد کو سجدۂ تعظیم	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/50
تذکرۂ نظامی	خواجہ حسن ثانی نظامی	قیمت: -/20
مادرِ ہمدرد	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/50
محرم نامہ	حضرت خواجہ حسن نظامیؒ	قیمت: -/200

ملنے کا پتہ: **خواجہ حسن ثانی نظامی**

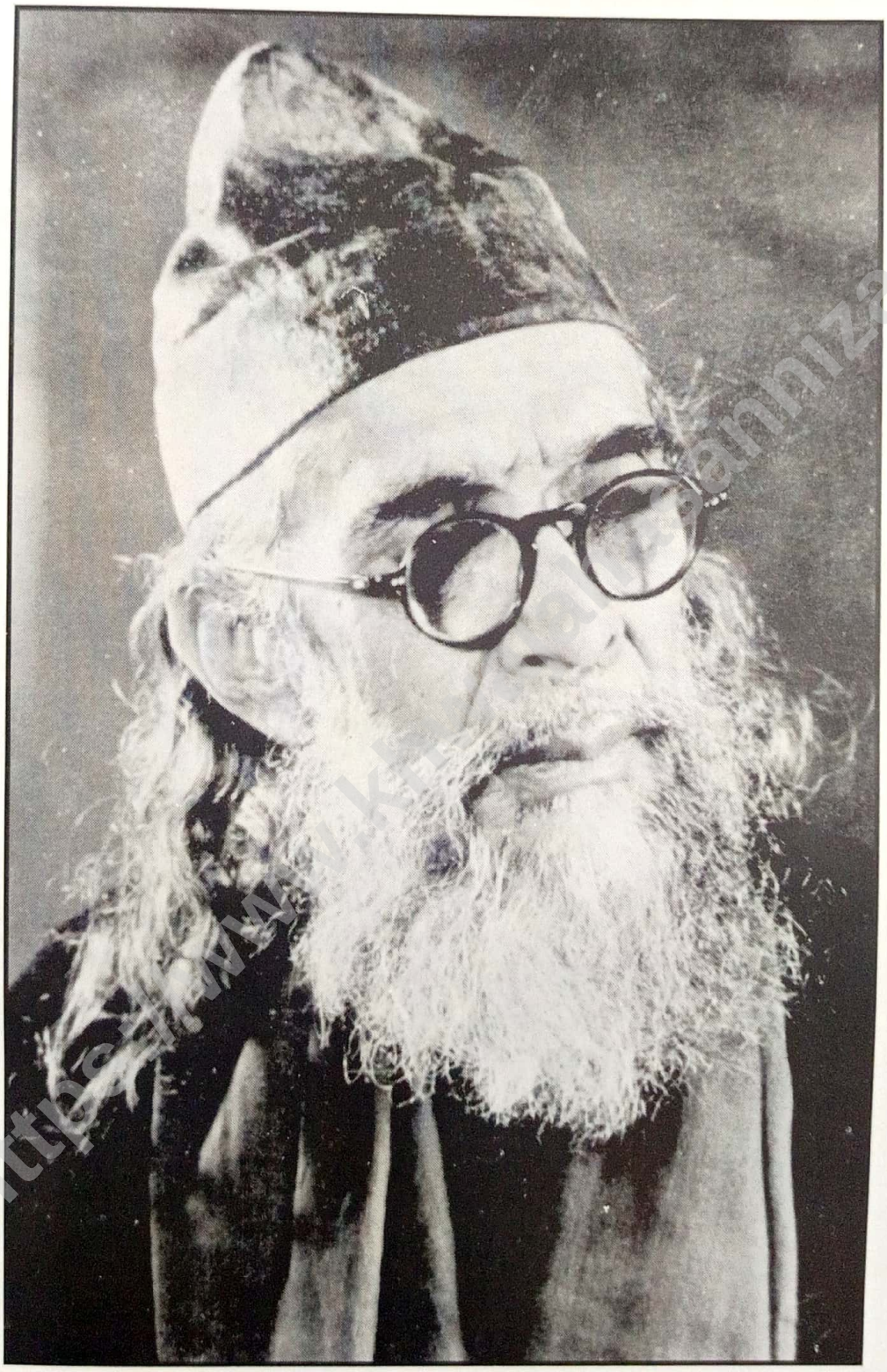
خواجہ ہال، بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ، نئی دہلی 110013

© https://www.khwajahasannizami.life



خواجہ سید علی نظامی (فرزند خواجہ صاحب)　　حضرت خواجہ حسن نظامی　　حضرت خواجہ حسین نظامی (فرزند اول خواجہ صاحب)

© https://www.khwajahasannizami.life

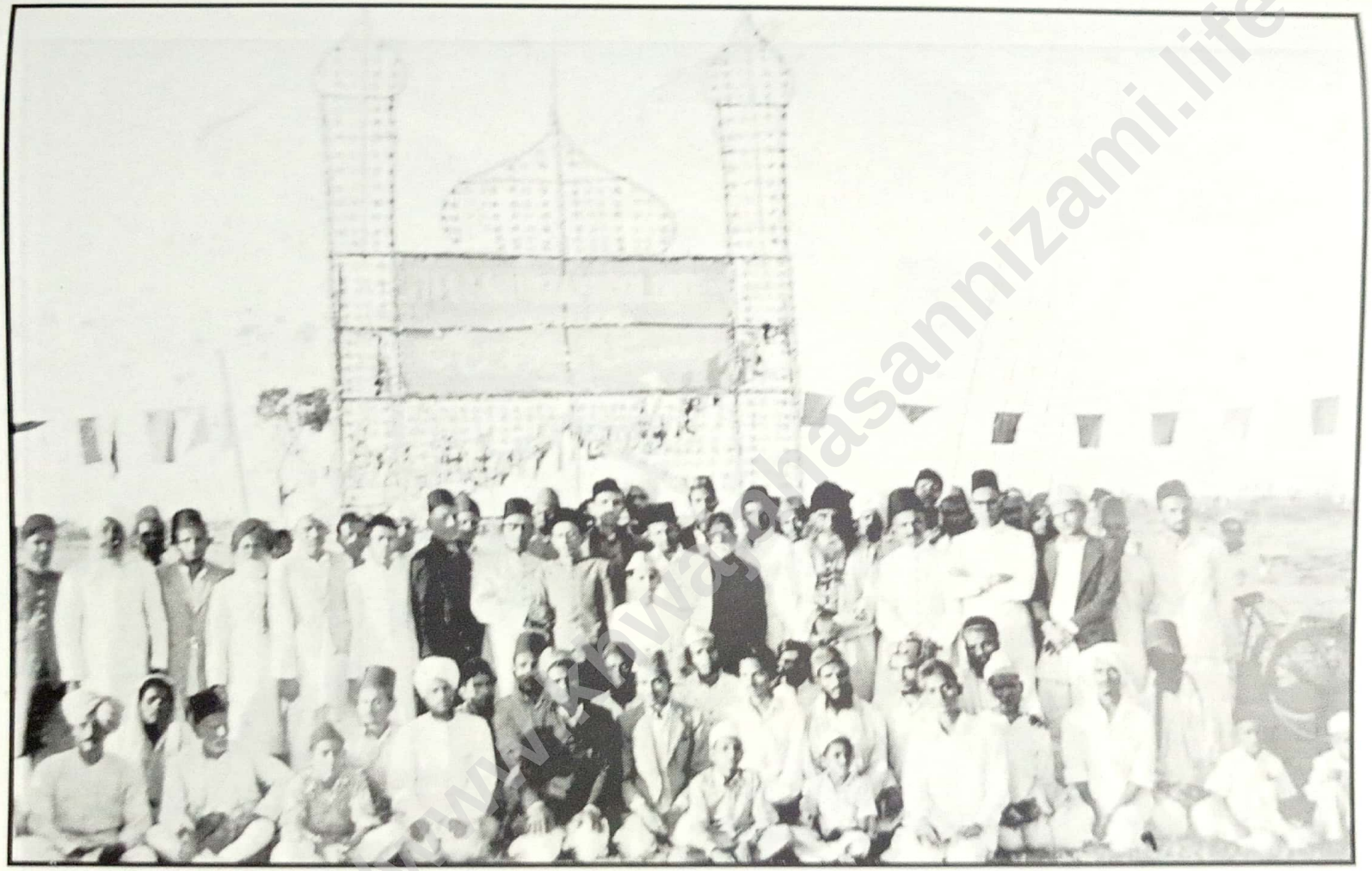


حضرت پیر و مرشد خواجہ حسن نظامی

© https://www.khwajahasannizami.life



قلمی تصویر حضرت خواجہ حسن نظامی رشی کیشن ہمالیہ سے آگے کے تاریخی تیرتھ استھان جہاں حضرت نے بیس سال گذارے۔



ناندیڑ مہاراشٹر کی یادگار تصویر

© https://www.khwajahasannizami.life



مکان حسینی خانہ حضرت خواجہ حسن نظامی کے اندورنی کمرے کی قدیم تاریخی اور یادگار تصویر

© http://www.khwajahasannizami.life



دہلی کے اخبار نویس ادیب، شعراء اور قلم کار حضرت خواجہ کے ساتھ

© https://www.khwajahasannizami.life



حضرت خواجہ حسن نظامی حسین نامے کے تاریخی برآمدے میں بنگالی اکابر اور قدیم دہلوی اکابر کے ساتھ

© https://www.khwajahasannizami.life



دہلی کے مشہور طبیب اول اور طب اداروں کے بانی حکیم اجمل خاں صاحب بھی طب میں حضرت خواجہ حسن نظامی سے فیض یافتہ رہے۔

© https://www.rekhta.org/khwajahasannizami.life



افریقہ کے عبدالمجید خاں نظامی پورے خاندان کے ساتھ حضرت خواجہ صاحب کے مشہور بیرونی خلیفہ

© http://www.khwajahasannizami.life



(دائیں طرف) حسین خانے میں موجود حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا خاندان
(بائیں طرف) مہاراجہ کشن پرشاد نظامی کا خاندان اور (پشت پر بیرونی اکابر و مغل اکابر)

© https://www.khanqah-nizamia.org/nizami.life



حضرت خواجہ صاحب کے مکان حسین خانے کی ایک تصویر قدیم
سفیروں، وائسرائے، بیگمات اور بچوں کے ساتھ

© https://www.rekhta.org/ahmadnizamilife



حضرت سجادہ نشین گولڑہ شریف پیر و مرشد حضرت خواجہ حسن نظامی

© https://www.nizami.life



پشتِ امام باڑہ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

© http://khwajahasannizami.life



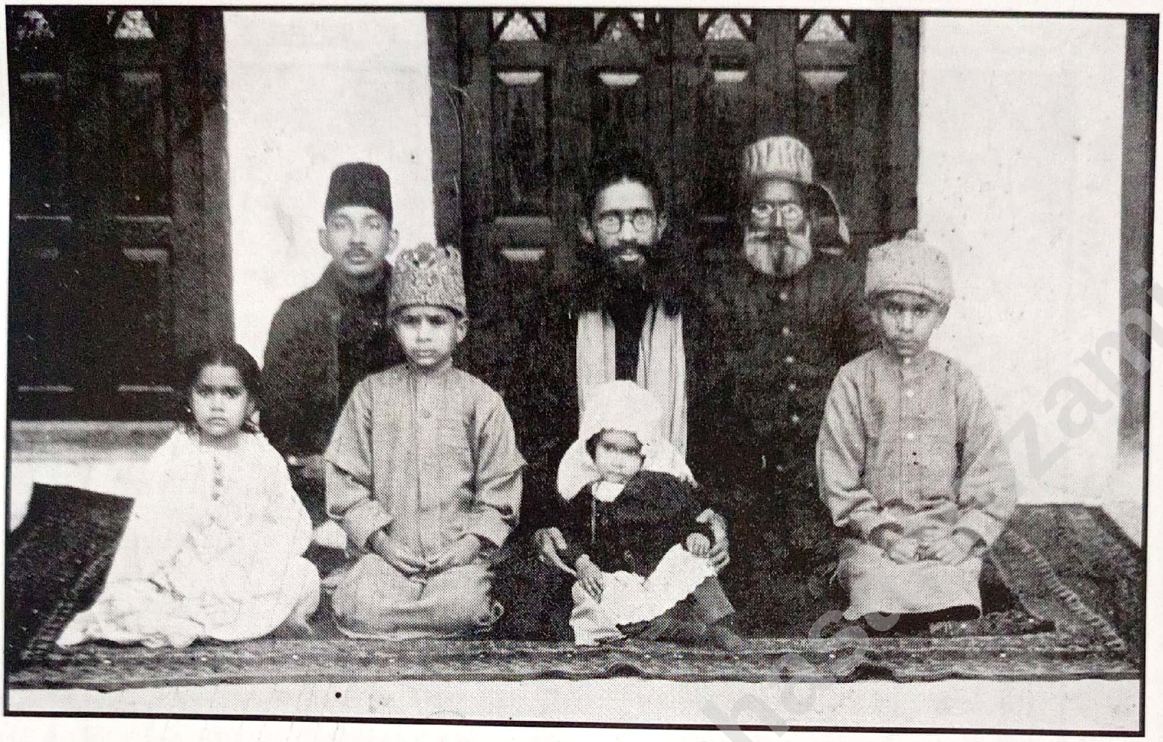
(1) سجادہ نشین اجمیر شریف، (2) سجادہ نشین گولڑہ شریف حضرت پیر مہر علی شاہ ((2) ہونے والے سجادہ نشین درگاہ حضرت بابا فریدؒ)

© http://www.khwajahasannizami.life

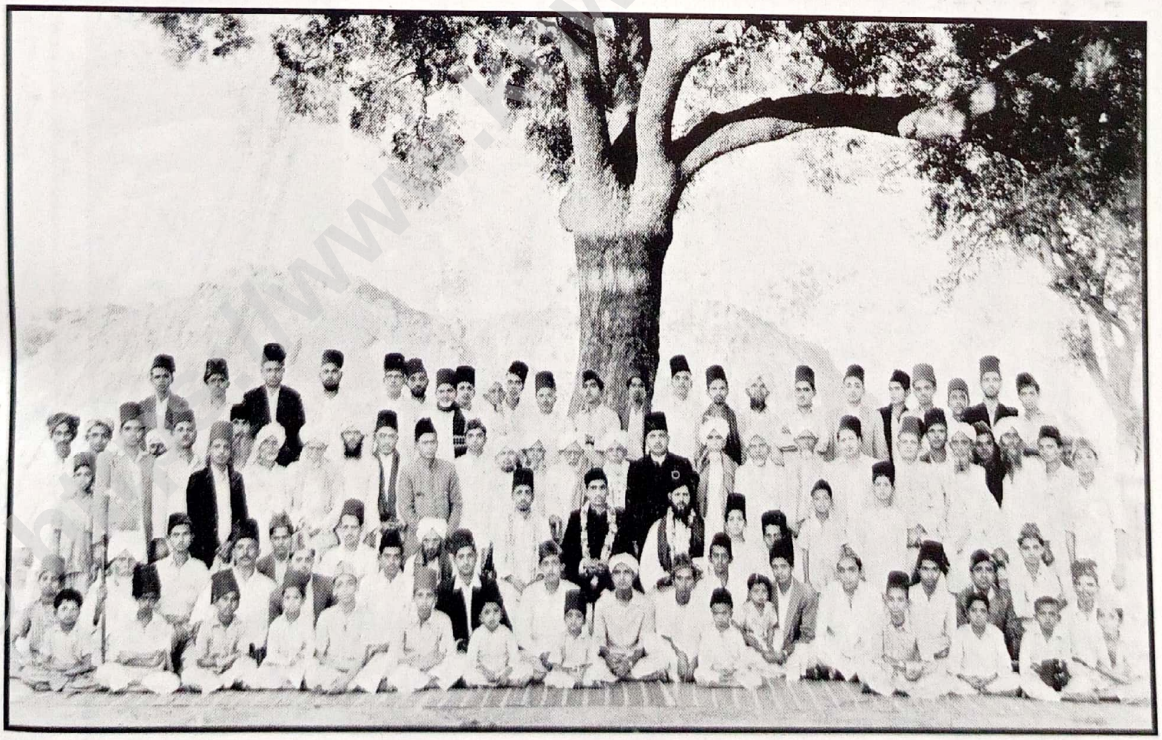


حکیم نابینا صاحب مشہور ترین طبیب حیدر آباد، دہلی و یوپی

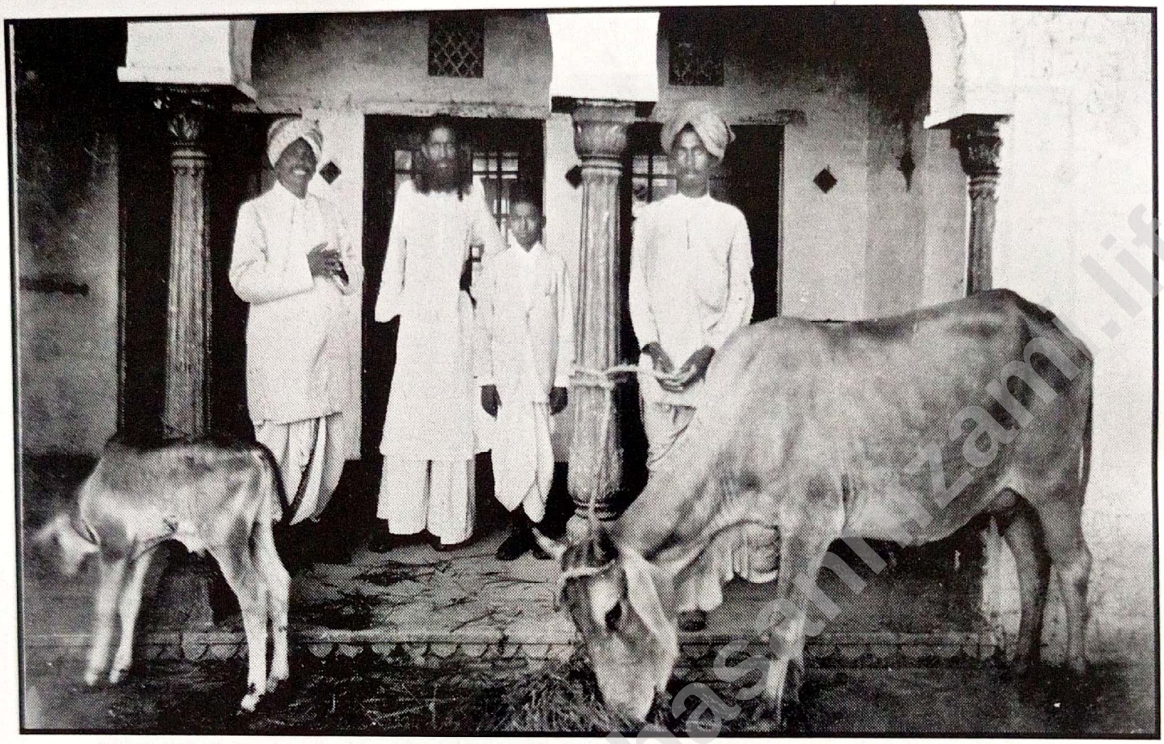
© https://www.khwajahassannizami.life



حسین خانے کا ایمان خانہ حضرت خواجہ کی اولاد تشریف فرما۔



استقبال خواجہ حسن ثانی نظامی ادھونی آندھرا پردیش



خسر و منزل حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

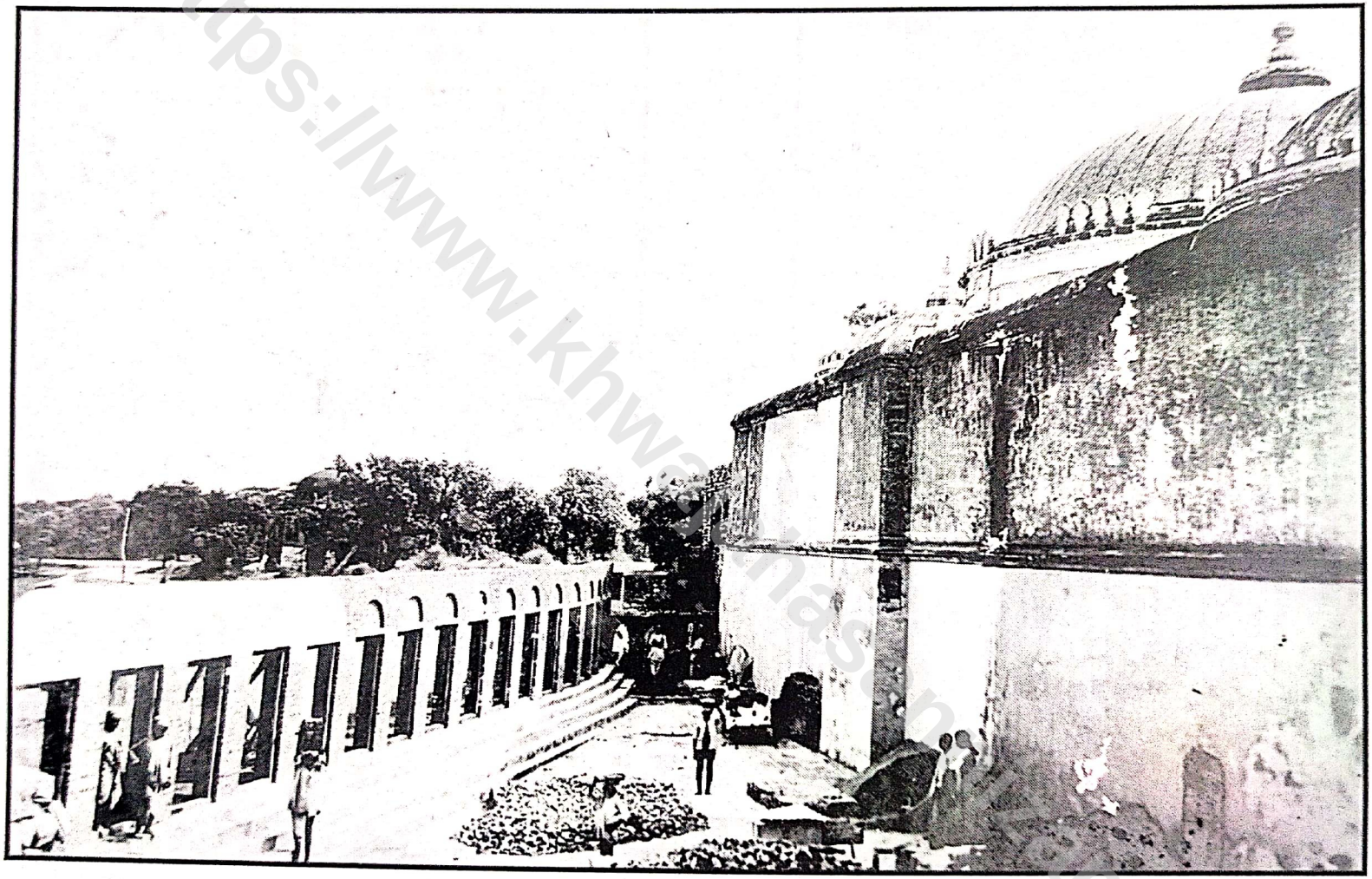


ہز ایکسی لینسی صدر جمہوریہ ہند اور خواجہ حسن ثانی نظامی

© https://www.khwajahasanzaim.life



ممبئی کے سیسون یہودی بزرگ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے مرید

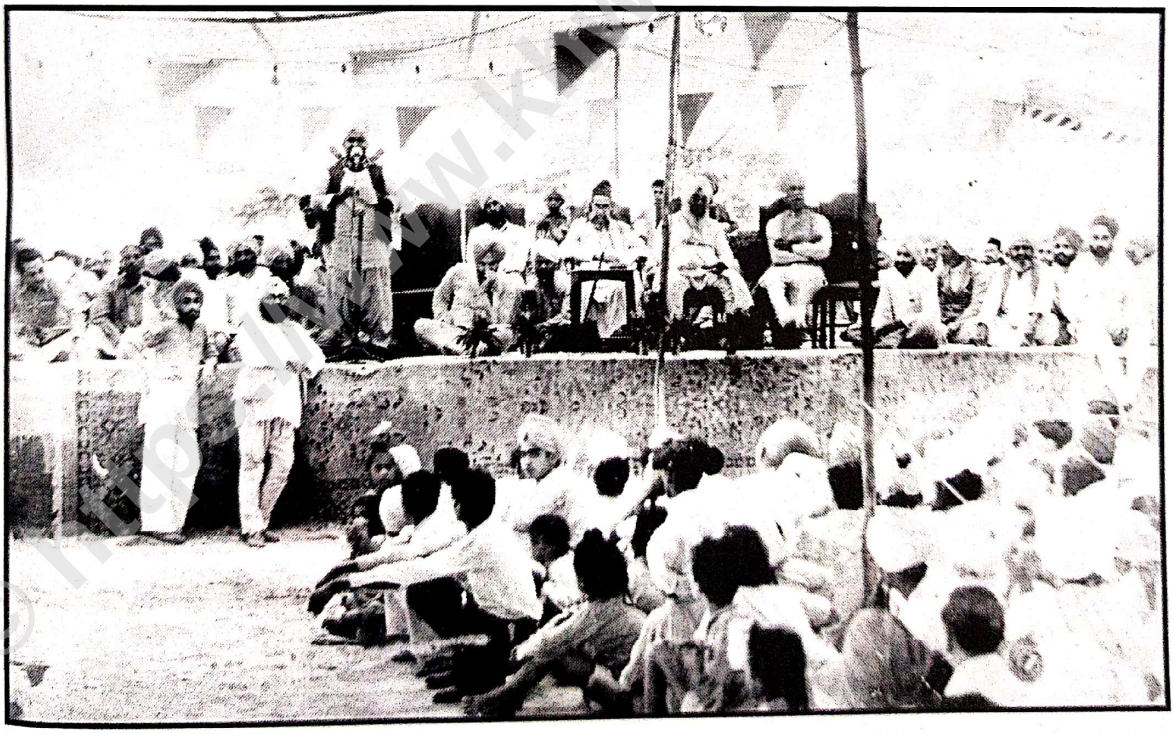


زیرِ تعمیر مسافر خانہ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

© https://www.khwajahasannizami.life

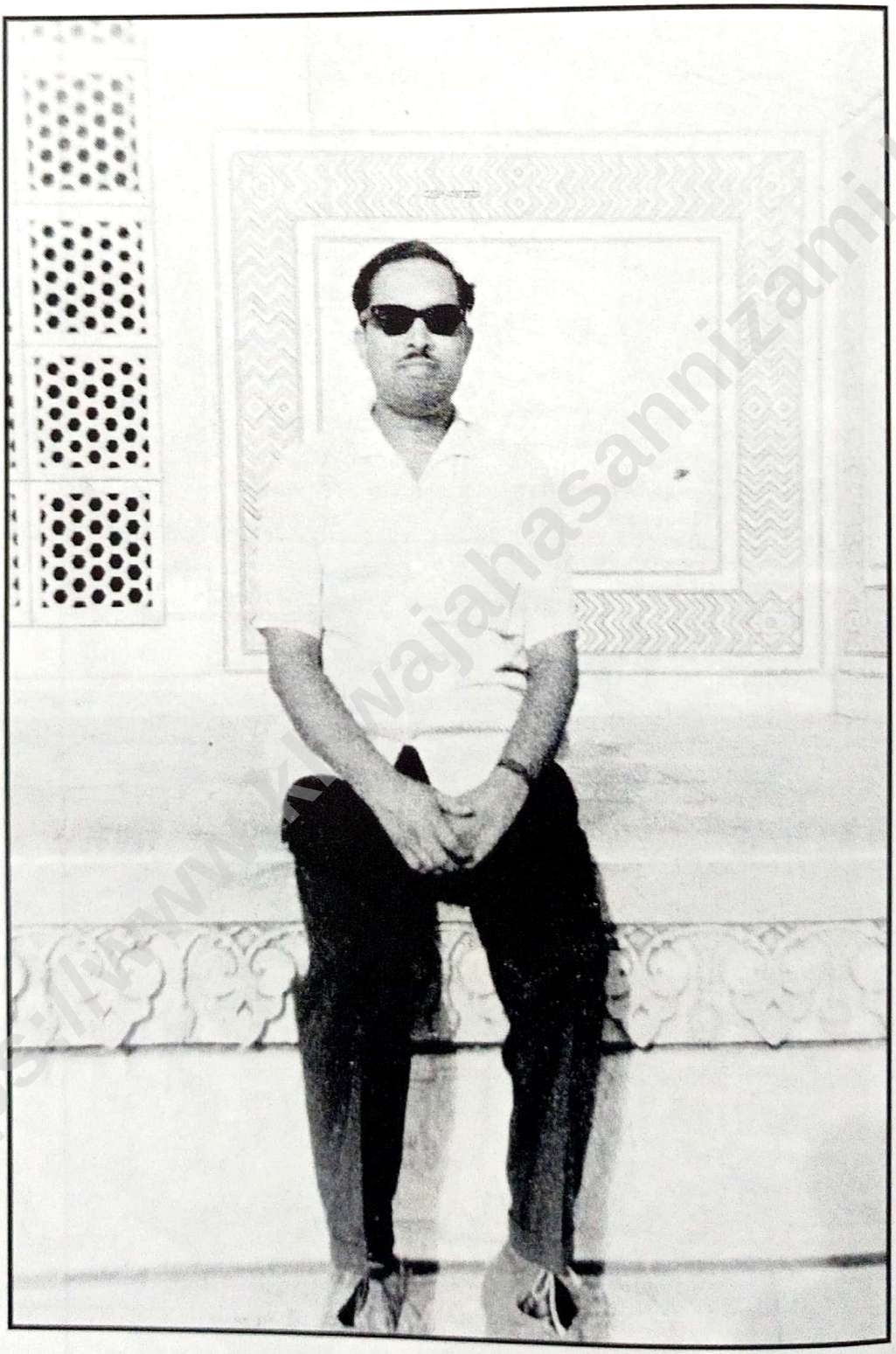


زیر تعمیر مسافر خانہ حضرت خواجہ حسن نظامیؒ



پٹیالہ میں مہاراجہ پٹیالہ نے حضرت خواجہ حسن نظامی کا استقبال کیا اور مسلمانوں کو پٹیالہ میں آباد ہونے کی دعوت دی۔

© http://www.khwajahasannizamilife



حضرت خواجہ سید مہدی نظامی فرزند پنجم وخلیفہ حضرت خواجہ حسن نظامی تعلیمی ڈگری لینے کے بعد

© https://www.khwajahasannizami.life



مزار حضرت کلیم اللہؒ پر صدر جمہوریہ وی وی گری صاحب، حضرت خواجہ حسن نظامیؒ سے خاص عقیدت رکھتے تھے

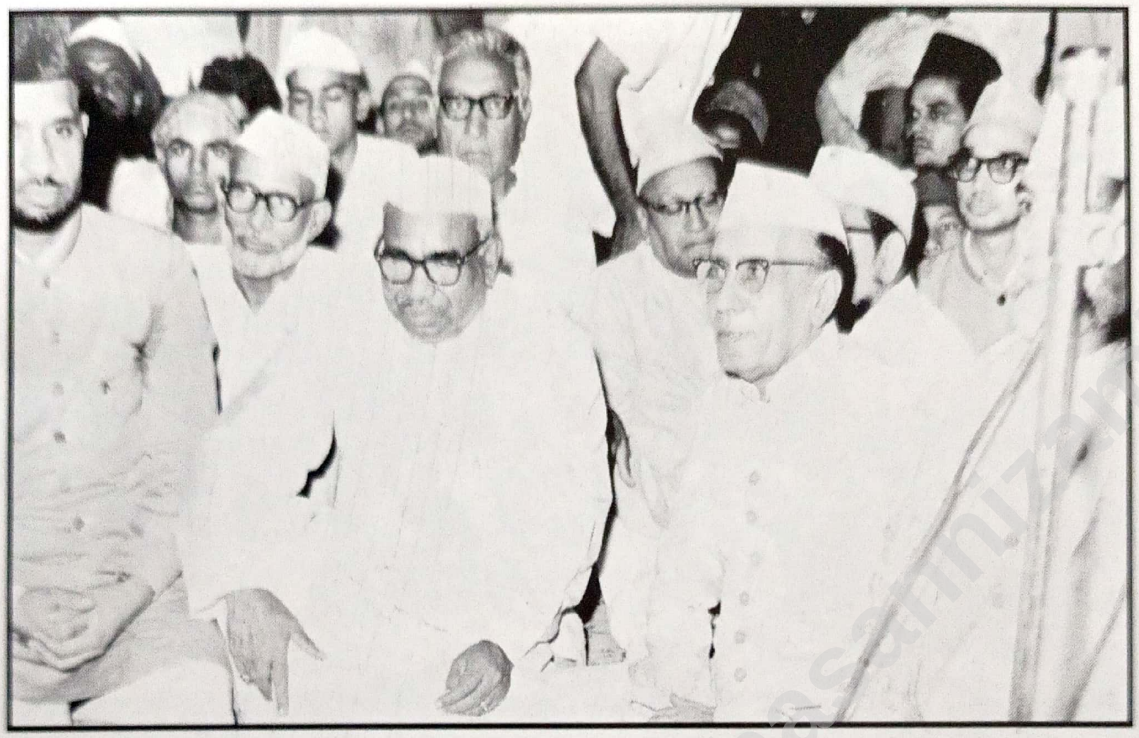
© Khwaja Hasan Nizami Institute
khwajahasannizami.life



حضرت خواجہ حسن نظامی اپنی آنکھوں کے آپریشن کے بعد بالا خانہ موتی محل



خواجہ حسن ثانی نظامی کا بچپن لاہور میں نامی گرامی اکابر کے ساتھ



(بائیں طرف سے) خواجہ حسن ثانی نظامی، عالیجناب بابو جگ جیون رام صاحب اور حضرت شوکت فہمی



ہندوستان کے ہوم منسٹر عالی اور دیگر اکابر

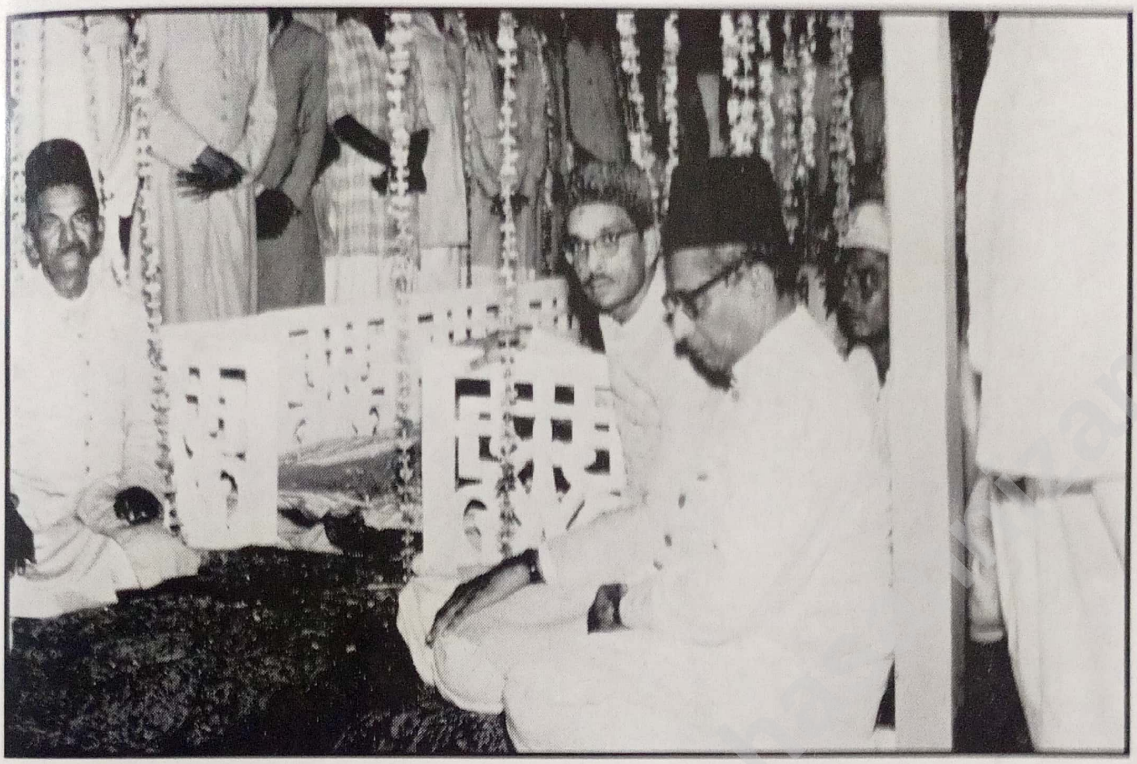


نماز جنازہ حضرت خواجہ صاحب درگاہ شریف حضرت محبوب الٰہی

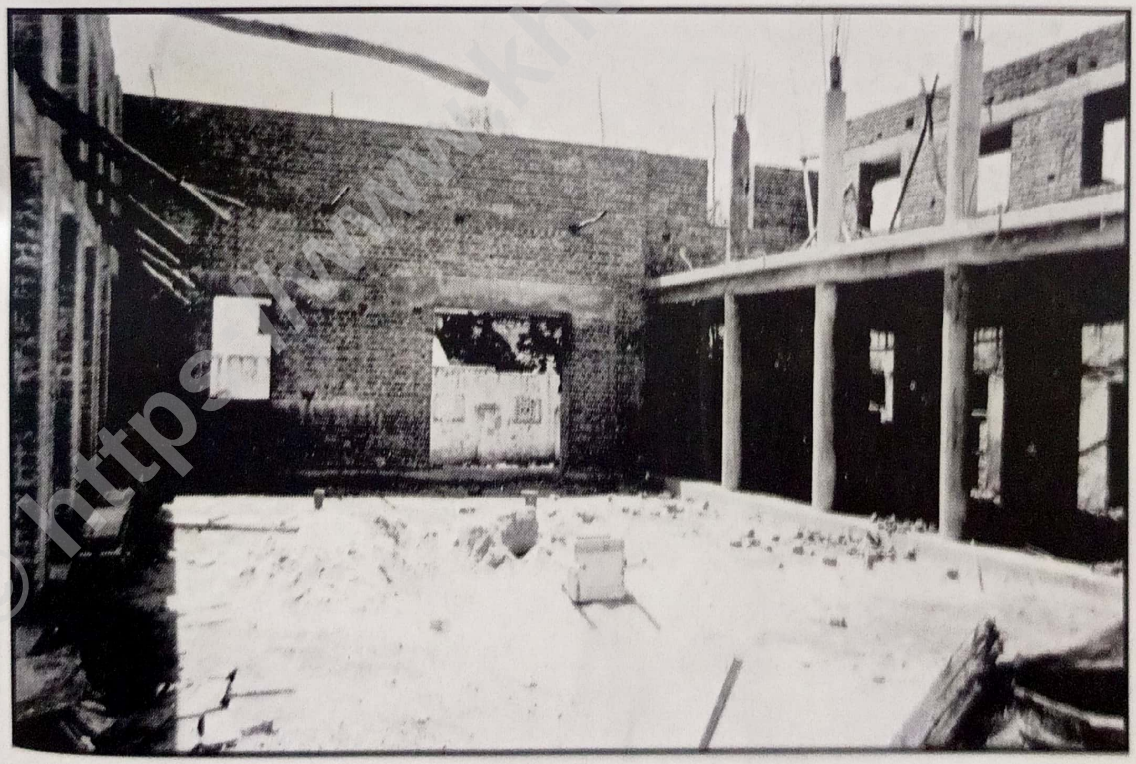


حضرت خواجہ صاحب کی نماز جنازہ درگاہ حضرت محبوب الٰہی میں

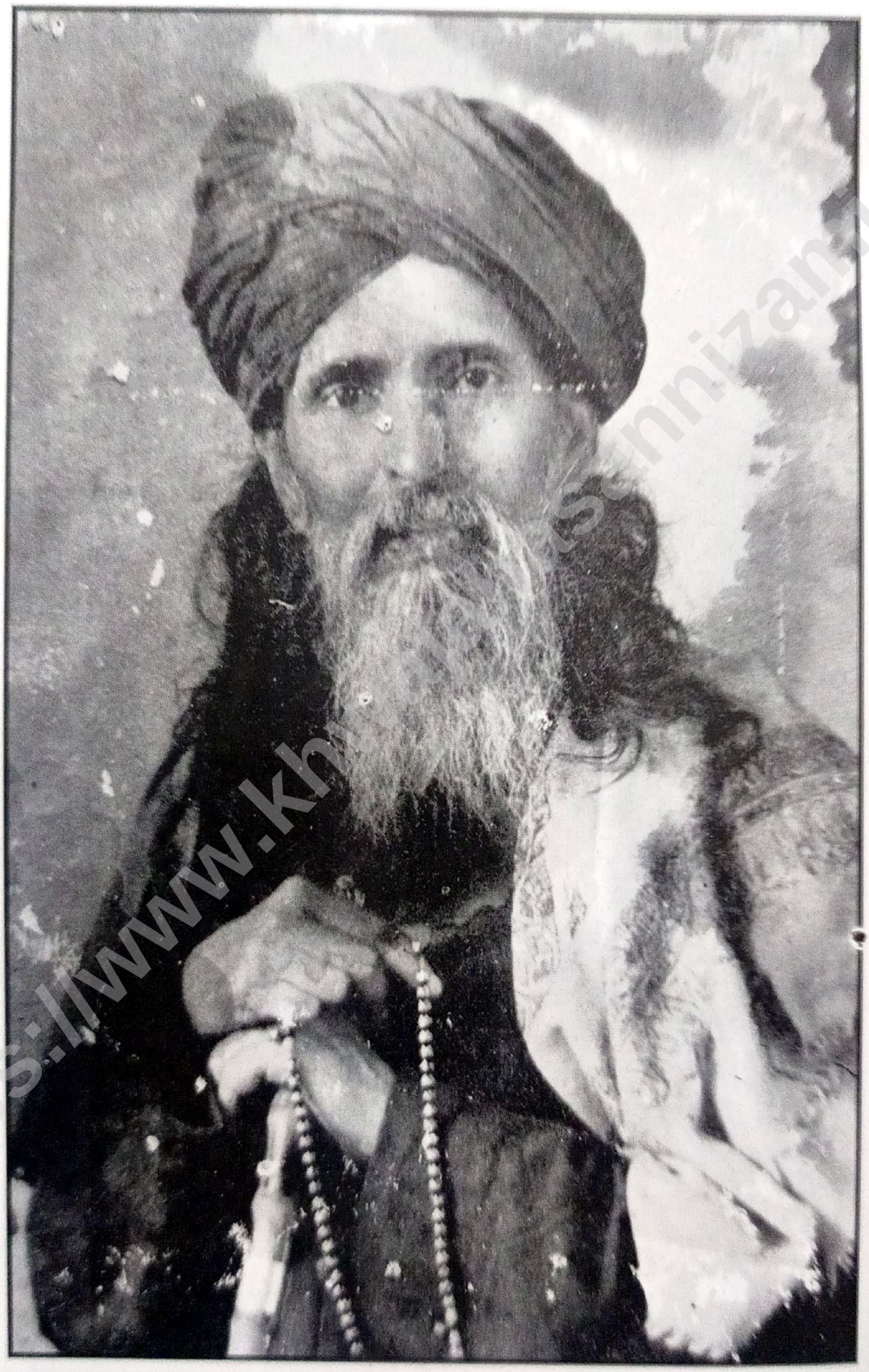
© http://www.khwajahasannizami.in



(دائیں طرف) عالیجناب فیاض الدین نظامیؒ آرکی ٹیکٹ اور ٹاؤن پلانر دہلی اور مکہ و مدینہ

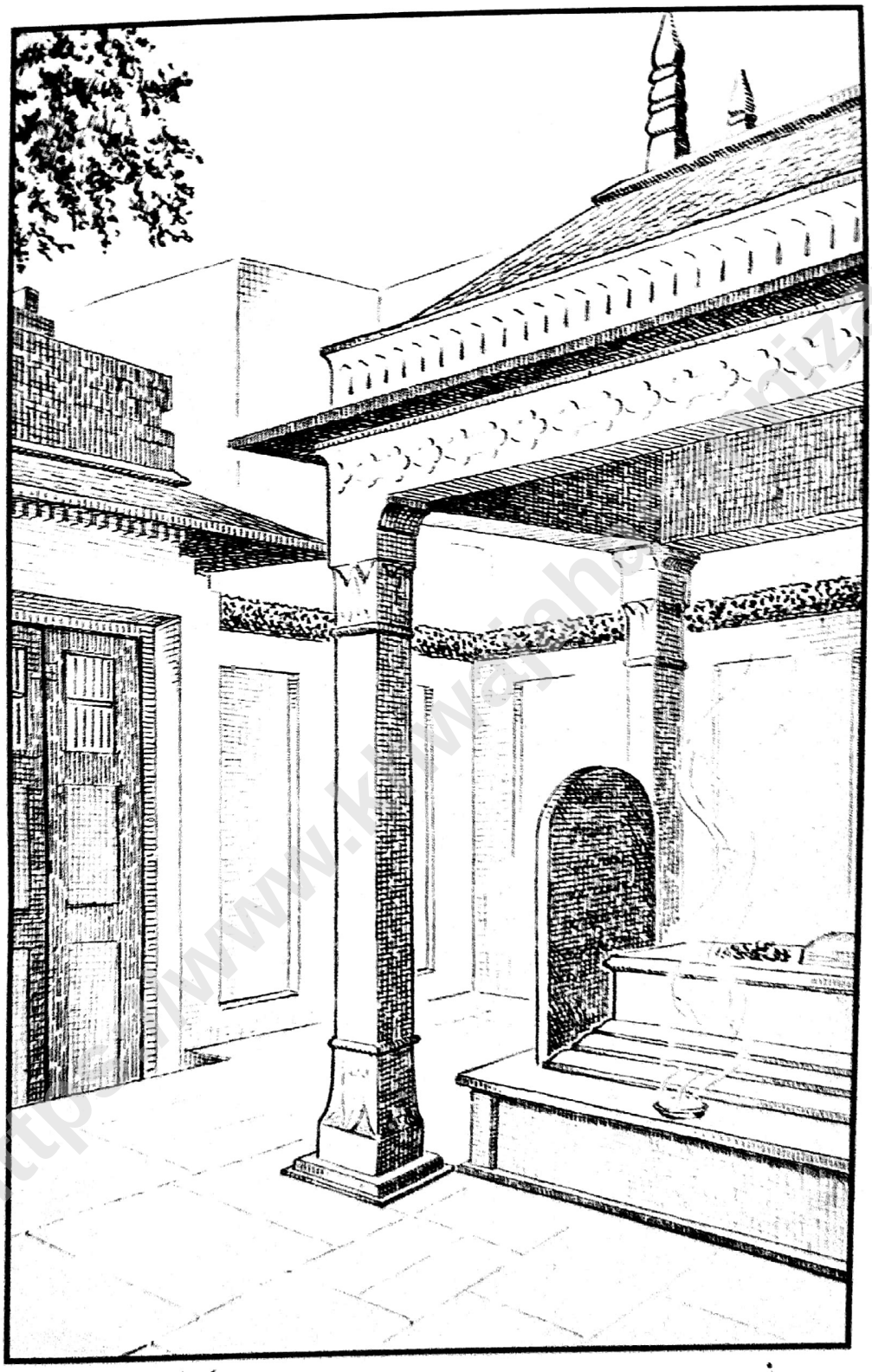


تعمیر خواجہ ہال



سجادہ نشین پھلواری شریف حضرت مولانا شاہ سلیمانؒ، پٹنہ، بہار

© https://www.khwajahasannizami.life



حضرت صوفی عنایت خاں مرحوم کا وہ مزار اور مقبرہ جو حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے خود فکر و فن کرنے کے بعد بنوایا۔

© https://www.khwajahasannizami.life



سر شاہ سلیمان

© https://www.khwajahasannizami.life



نواب صاحب لوہارو کے بڑے داماد حضرت خواجہ حسین نظامی اپنے والد حضرت خواجہ حسن نظامی کے مزار پر

© https://www.khwajahasannizami.life



پنڈت جواہر لال نہرو نظامی بچوں کے ساتھ

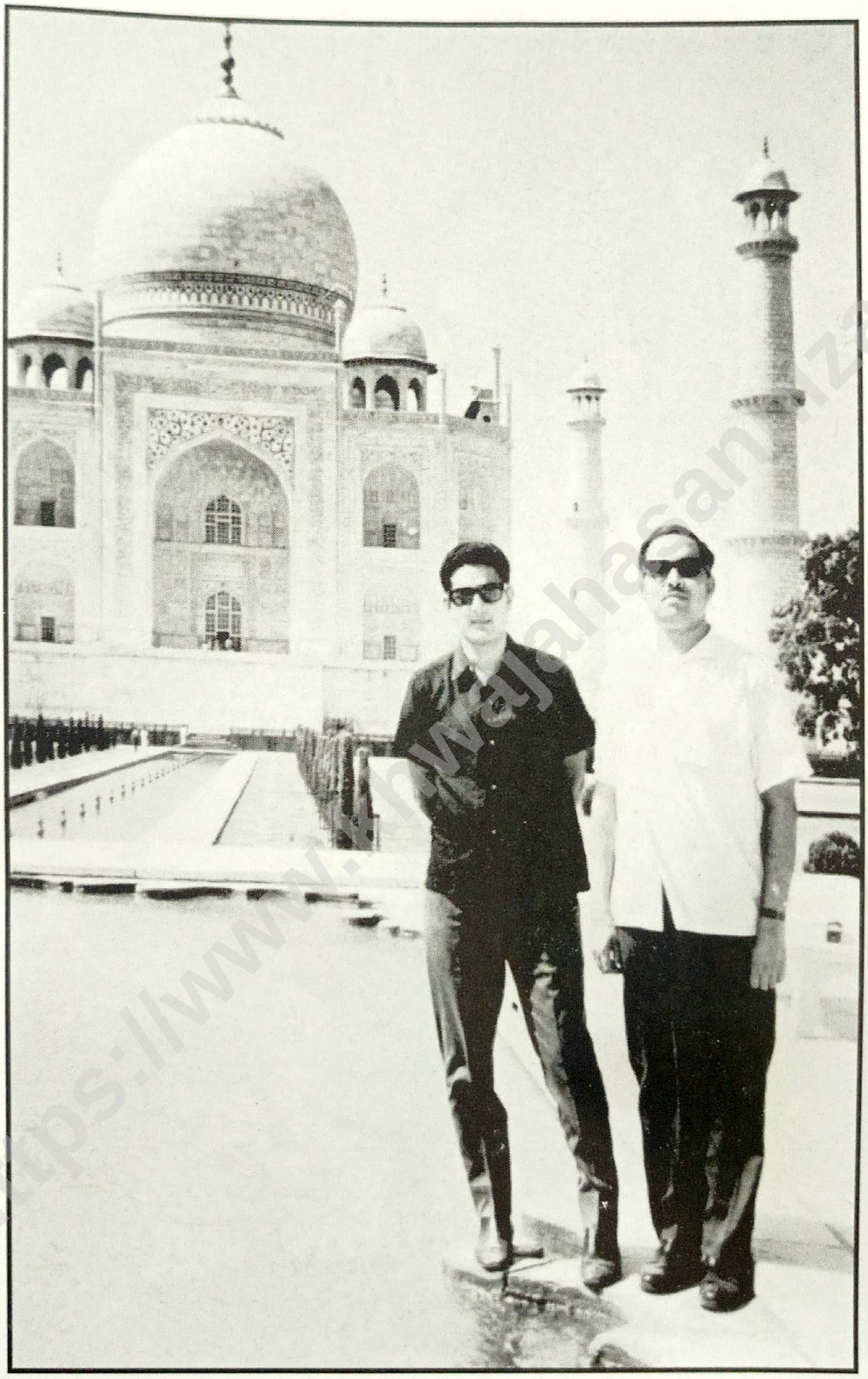


حضرت خواجہ حسن نظامی کی بڑی بیٹی روح بانو کے شوہر سید عبدالسلام



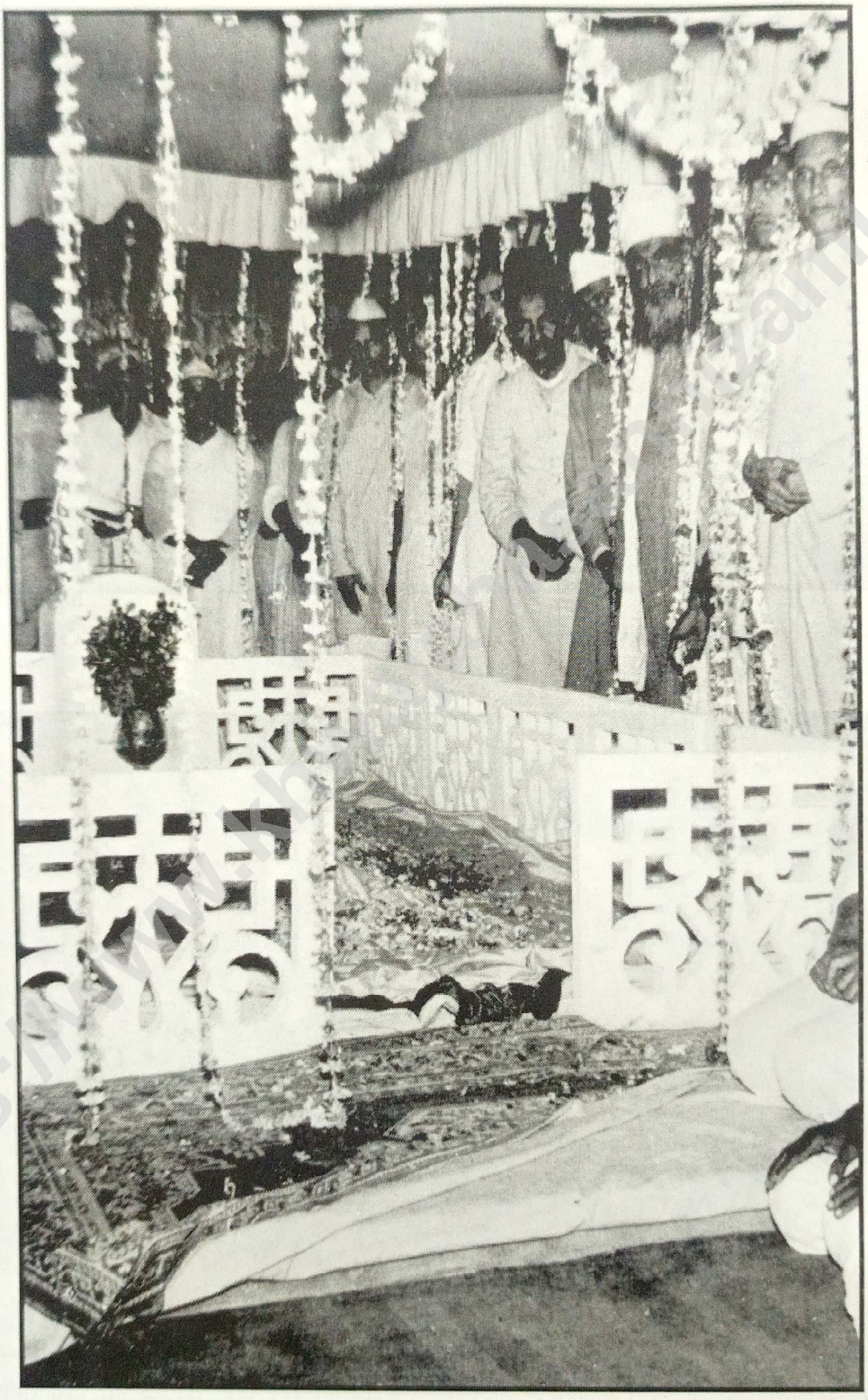
حیدرآباد کے مشہور قادری اور چشتی خاندان کی انگریز اہلیہ اپنی بڑی بیٹی نسیم فاطمہ چاند کے ساتھ

© https://www.khwajahasannizami.life

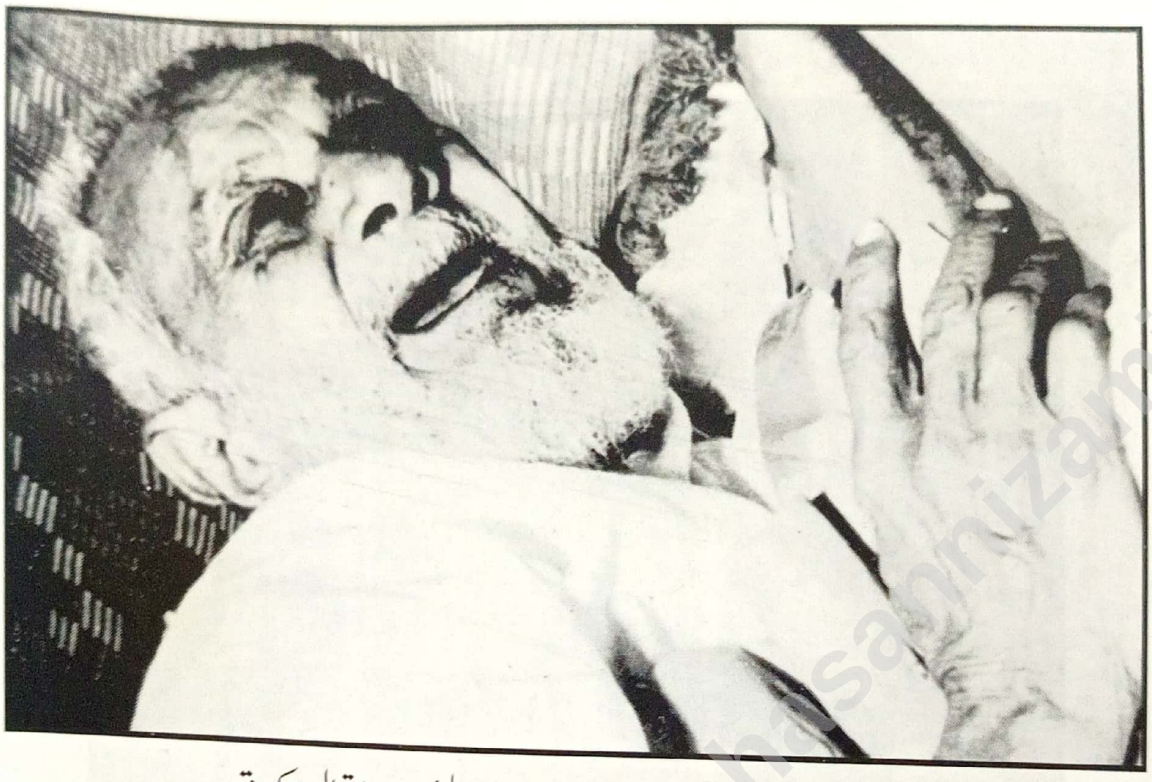


تاج محل خواجہ سید مہدی نظامی اور حیدر آباد کے پیر بھائی سید اصغر حسین چشتی قادری نظامی

© https://www.khwajahasannizami.life



حضرت حکیم، پیر خسرو شاہ نظامی حضرت خواجہ صاحب کے مزار پر دوسرے مریدوں کے ساتھ



حضرت خواجہ حسن نظامی کے خاص دوست ملا واحدی دہلوی اپنے انتقال کے وقت



خواجہ حسن ثانی نظامی ہوم منسٹر صاحب (دائیں طرف) عالی جناب فیاض الدین نظامی، شہرۂ آفاق مکی مدنی دہلوی حکیم خسرو شاہ نظامی
ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم حضرت مستحسن فاروقی

© https://www.khwajahasannizami.life

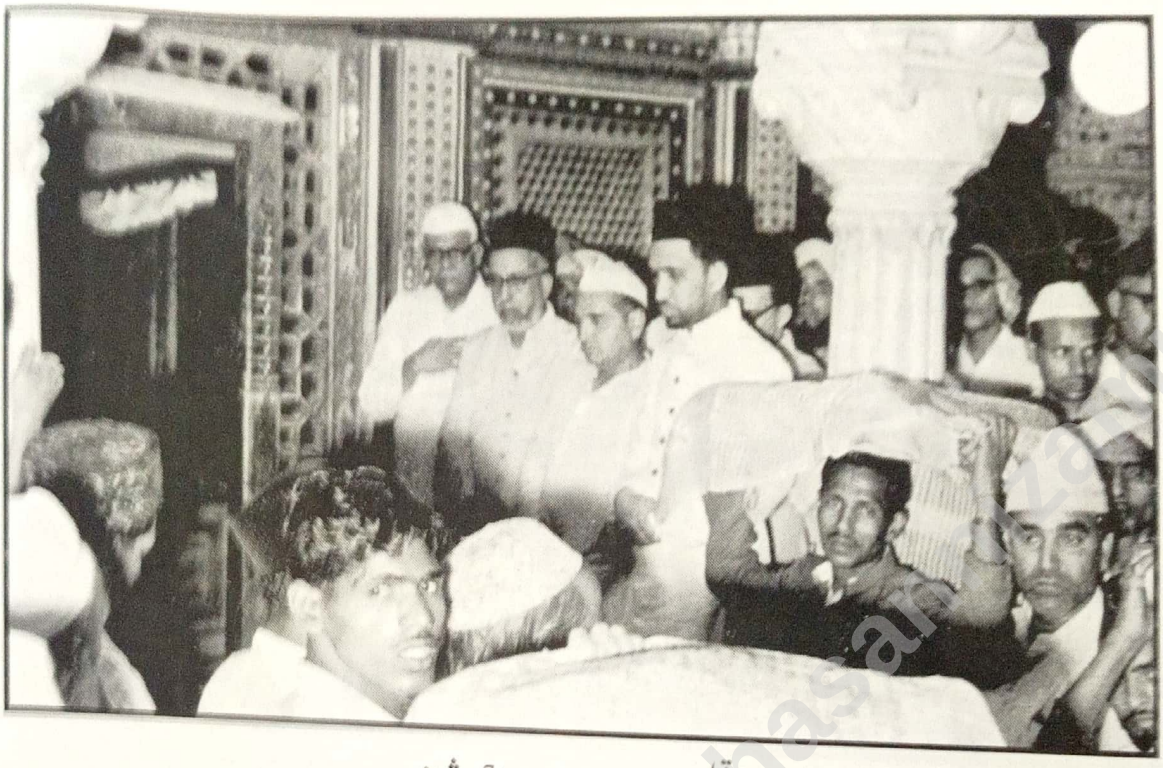


(۱)ابن عربی نظامی (۲)حسین نظامی (۳)روحہ نظامی (۴)علی نظامی



(۱)عالیجناب پنت صاحب (۲)عالیجناب خورشید عالم صاحب (۳)پروفیسر خسروصاحب (۴)پروفیسر نثار فاروقی صاحب

© http://www.khwajahasannizamilife

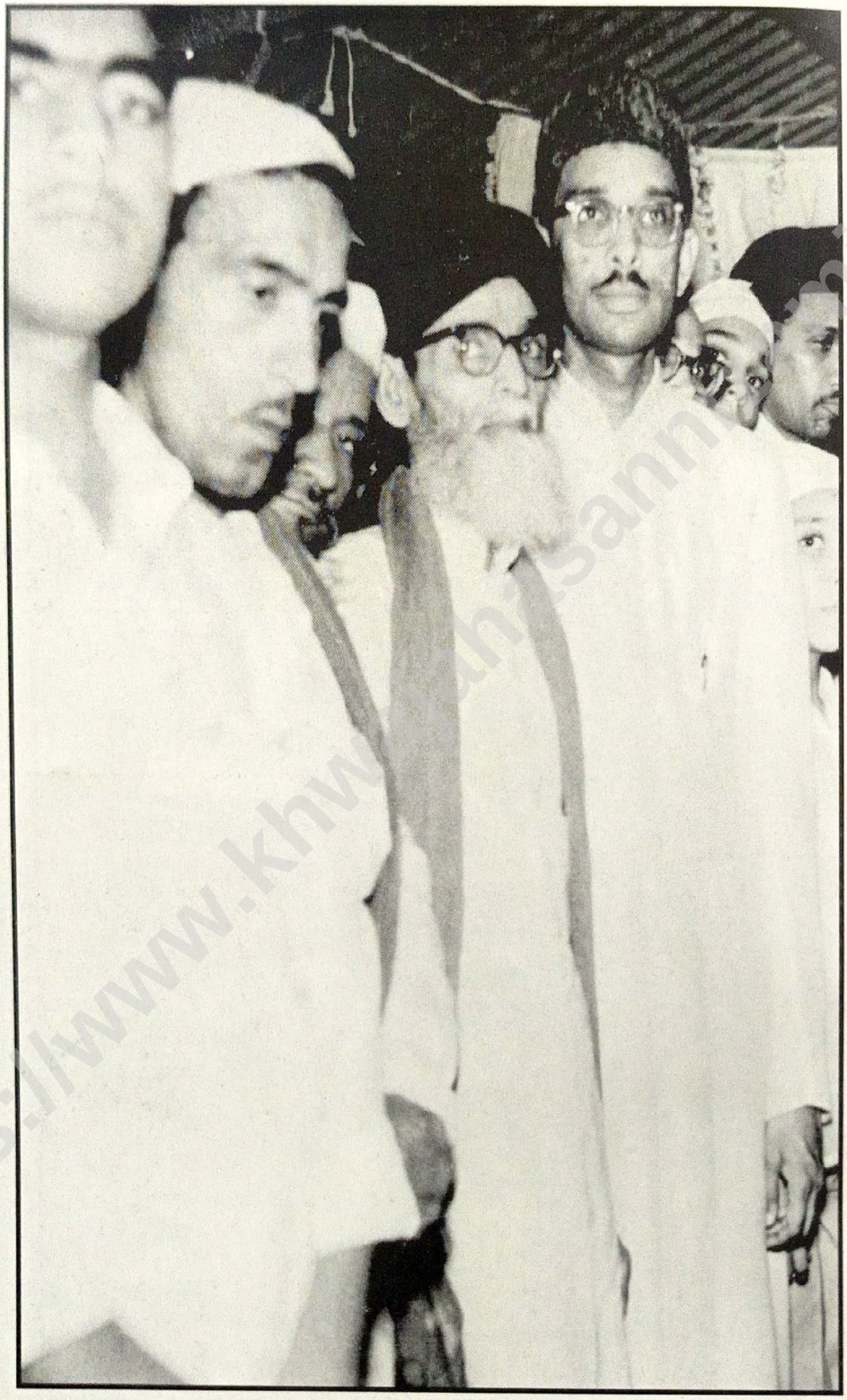


ہلال قطبی صاحب اور صاحبزادہ اجمیر شریف



(۱) حکیم خسرو شاہ (۲) خواجہ حسن ثانی نظامی

© https://www.khwajahasan-nizami.life



حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کے بڑے فرزند خواجہ حسین نظامیؒ (نواب صاحب لوہارو کی بڑی صاحبزادی دل آرا بانو نظامی کے شوہر)
اور ساتھ میں سجادہ نشین پھلواری شریف، بہار

© https://www.khwajasanami.life



حضرت خواجہ حسن نظامیؒ مہتر چترال کے ساتھ

© https://www.khwajahasan-nizami.life

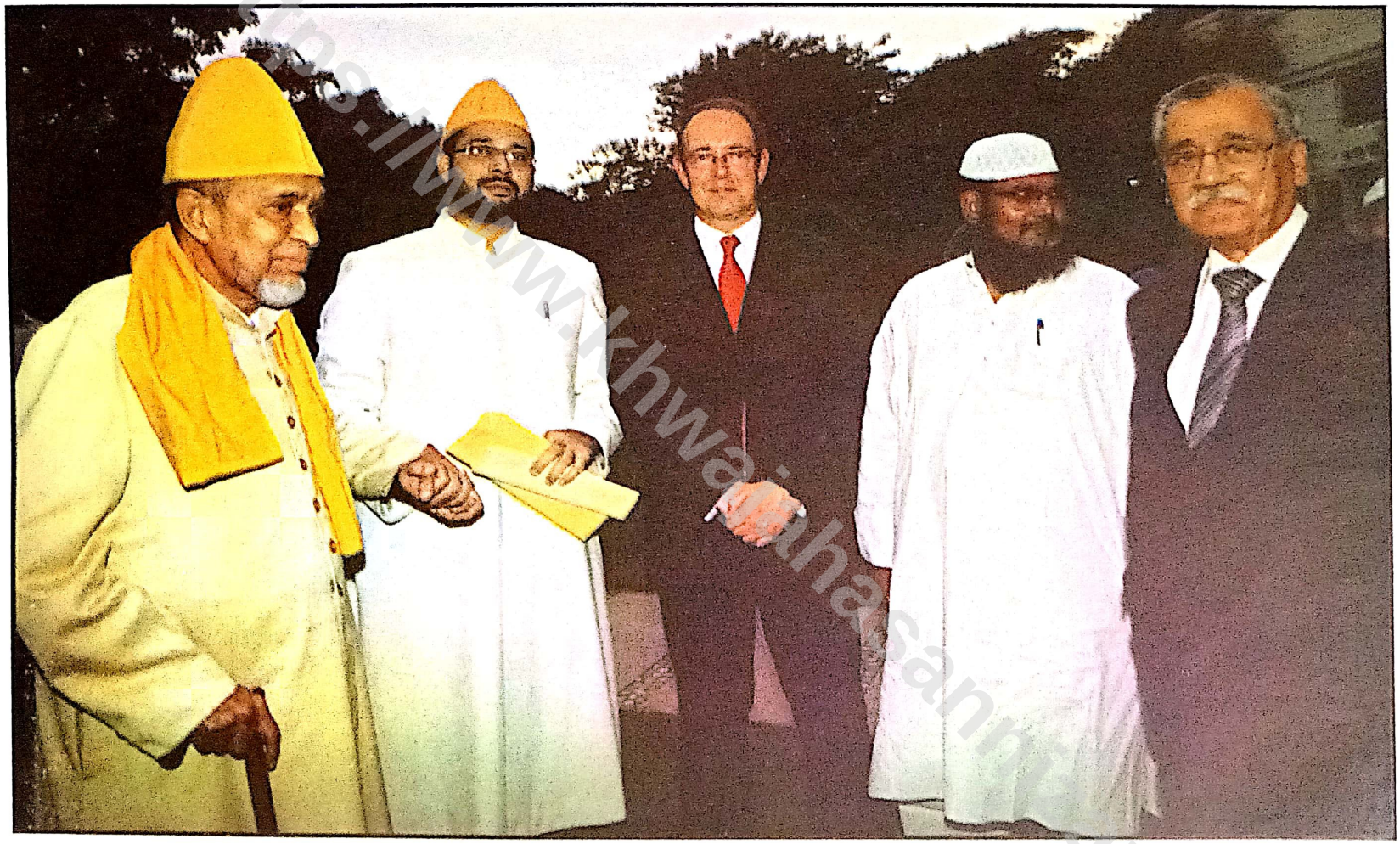
ہندوستان میں سعودی عرب کے سفیر سعود الصانی، حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی اور سعودی عرب کے قونصل
ہز ایکسی لینسی ترکی الفیصل

© https://www.khwajahasannizami.life



سعودی عرب کے شہزادے ہز ایکسی لینسی ترکی الفیصل اور ساتھ میں خواجہ حسن ثانی نظامی

© https://www.khwajahasannizami.life



(دائیں طرف) دہلی کے مشہور بزرگ کمشنر، خواجہ حسن ثانی نظامی اور خواجہ سید محمد نظامی کے ساتھ برٹش ہائی کمشنر سر جیمس بیون

© https://www.khwajahasannizami.life



برٹش ہائی کمشنر صاحب کو خواجہ سید محمد نظامی ایک قدیم سند دکھاتے ہوئے، اور ساتھ میں خواجہ حسن ثانی نظامی

© https://www.khwajahasannizami.life



خواجہ حسن ثانی نظامی، ایس ایم ظفر نظامی (جانشین حضرت کشفی شاہ نظامی) سابق وزیر قانون پاکستان اور سید محمد نظامی

© http://www.khwajahasannizami.life
Khwajahasannizami.life



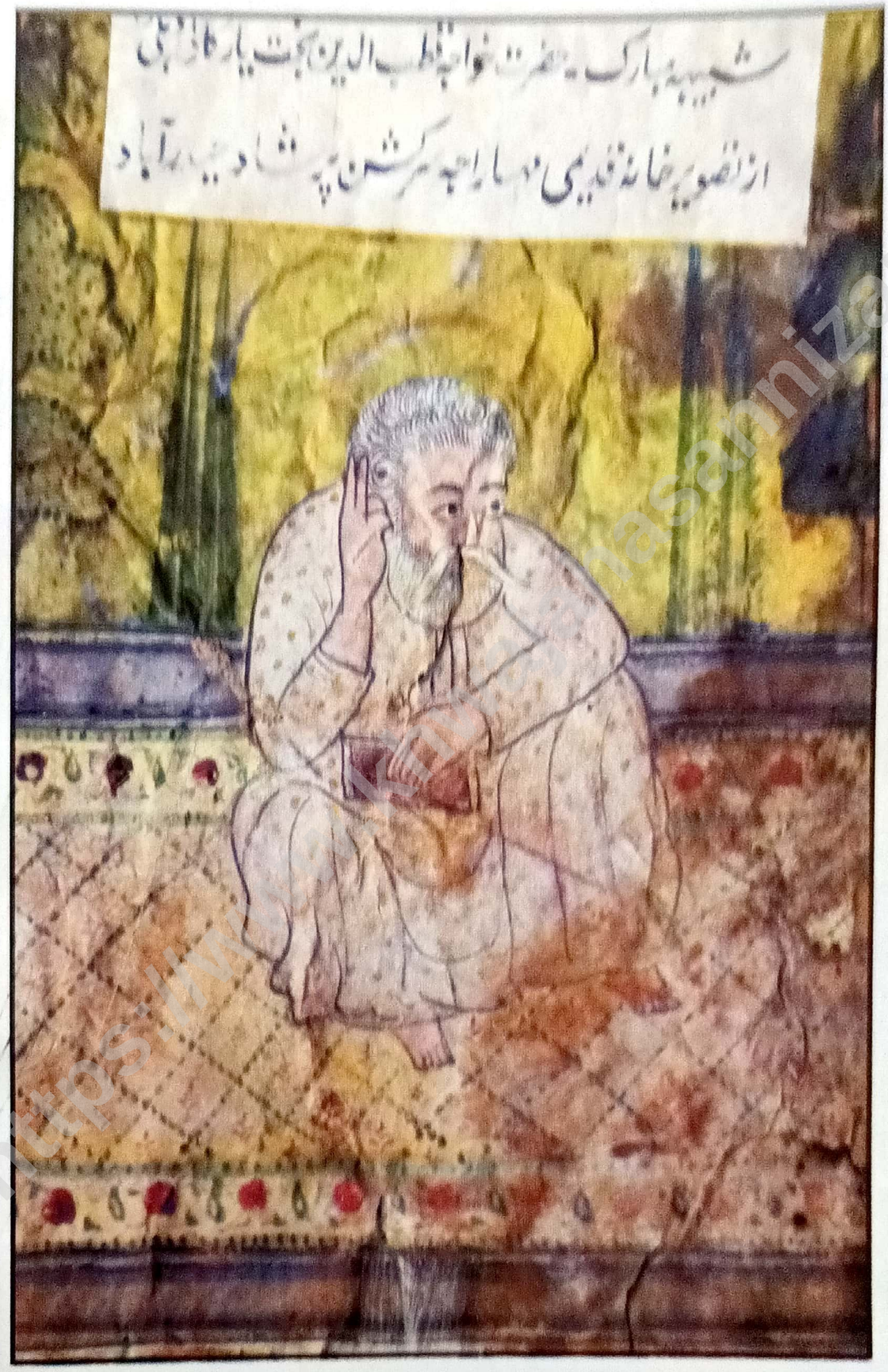
اپنے زمانے کی سب سے مشہور فلم و خاندان کی ہستی عالی جناب راجیو گاندھی

© http://www.khwajahasannizami.life

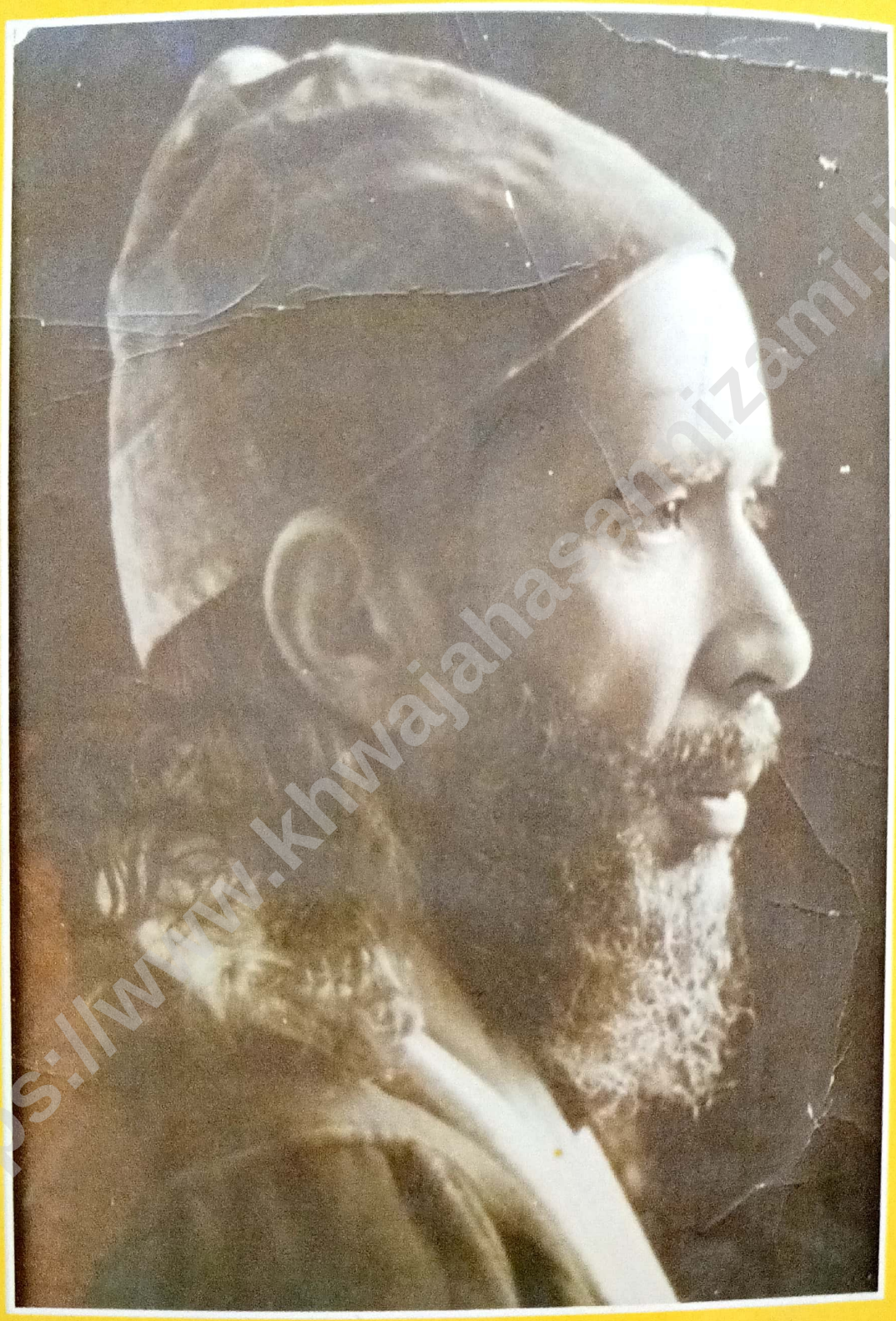


شبیہہ مبارک حضرت مولانا رومی صاحب مثنوی

© https://www.khwajahasannizami.life



© https://www.facebook.com/hasannizami.life



شمس العلماء مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی

قدیم ترین دہلوی شہری

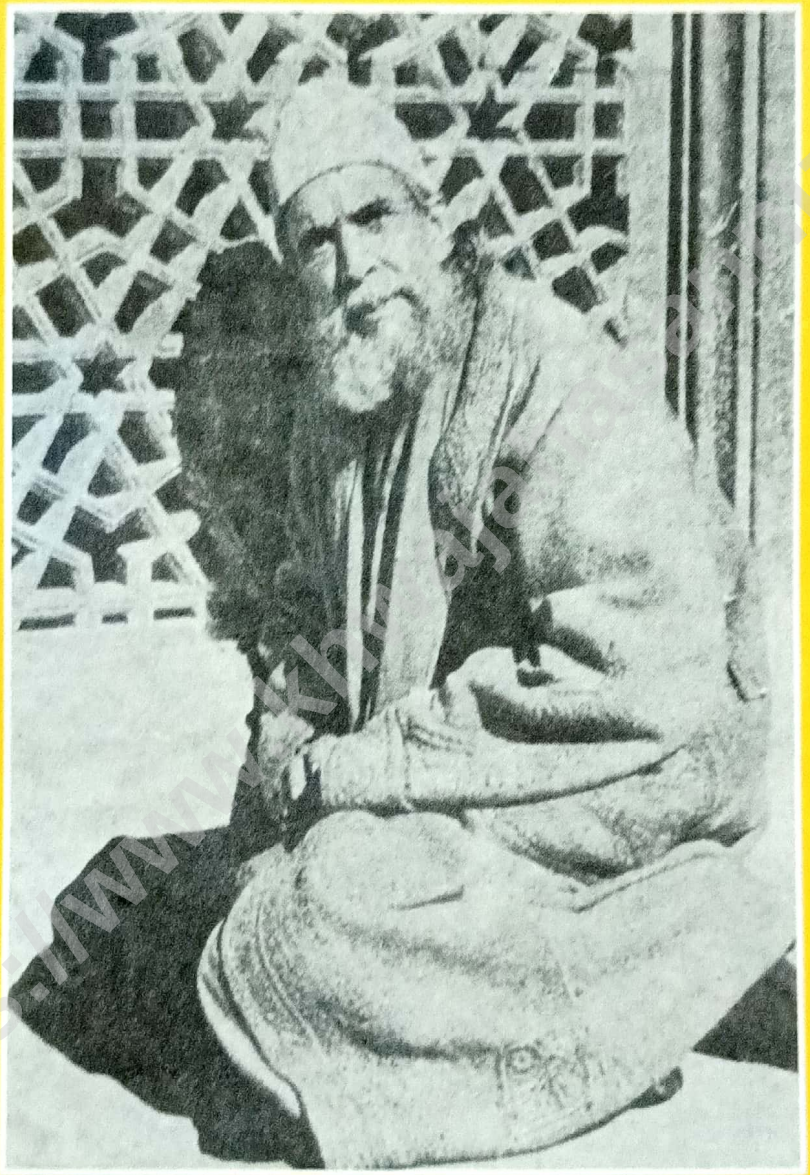
© https://www.khwajahasannizami.life

Postal Regn. No. DL(S)-01/3117/2012-14
RNI No.-793/57

Volume 86 OCTOBER - 2012 Issue No. 10

THE MUNADI DELHI

Telephone : 24359807



مُصوّرِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ

Printer, Publisher & Owner Khwaja Hasan Sani Nizami
Printed at : M.R.Printers, Street Garhiyya, Kucha Chellan, Darya Ganj, New Delhi-110002
Published from Dargah Hazrat Khawaja Nizamuddin Aulia, New Delhi-13

© https://www.khwajahasansaninizami.life